

# عکس

(مراٹھی خاکوں کے اردو تراجم)

لارڈ خواجہ

مترجم

محمد سین پرکار

# عکس



ہندستانی پرچار سجھا کی اشاعت

عکس



پ۔ ل۔ دیش پانڈے

---

عکس

# عکس

(مراٹھی خاکوں کے اردو تراجم)

☆ مصنف ☆

پ۔ ل۔ دلیش یانڈے

☆ مترجم ☆

محمد حسین پرکار

موج پر کاشن گرہ (مبی) کو اقتباسات کی اشاعت تجدید اشاعت اور تراجم کے حقوق حاصل ہیں۔ باقی ماندہ حقوق پے۔ ل۔ دلیش پانڈے فاؤنڈیشن (پونے) کے اختیار میں ہیں۔

نام کتاب	:	عکس (خاکے)
مصنف	:	پے۔ ل۔ دلیش پانڈے
مترجم	:	محمد حسین پرکار
اشاعت اول	:	مئی ۲۰۰۵ء
تعداد	:	پانچ سو (۵۰۰)
سیر ورق	:	رضوان اشتیاق
کپوزنگ	:	اعظمی گرافس (عائشہ منزل، پائپ روڈ، کرلا، ممبی ۷۰)
طبع	:	حناپریس (کرلا، ممبی)
ناشر	:	شری سبھاش وی سپٹ (ٹریسٹی واعزادی سیکریٹری) ”ہندستانی پرچار سبھا“، ممبی۔
اهتمام	:	اعظمی پبلی کیشن (مبی)

ISBN 81-902-435-3-5

## AKS

( Marathi Sketches Written by : P.L. Deshpande)

Translation into Urdu

By : MOHAMMAD HUSAIN PARKAR

HINDUSTANI PARCHAR SABHA

M.G.M. BUILDING, NETAJI SUBHASH ROAD, MUMBAI - 02.

## انتساب

برادری نسبتی ماہر اقتصادیات  
ڈاکٹر محمد قاسم دلوی (ڈاکٹر ایم کیو دلوی)  
کی  
شفیق یادوں کے نام  
جن کی علمی، تعلیمی اور سماجی خدمات  
نئی نسلوں کے لیے  
ہمیشہ مشعل راہ بنی رینگی۔

## فہرست

ڈاکٹر محمد الحق جنخانہ والا	حرف آغاز
ڈاکٹر رام پنڈت	تاریخی دستاویز
محمد حسین پرکار	عکس، زیر عکس
	نندا پردهان
	انتوبروا
	سکھارام گلش
	کھانولکر
	وودھاؤس
	راو صاحب
	رُگ ویدی

---

عکس

## توفِ آغاز

زبانوں کے قریب آنے کا معاملہ ہو یا تہذیبوں کے رشتے کا دونوں میں ترجیح کی اہمیت مسلم ہے۔ جب تہذیبوں قریب آتی ہیں تب ترقی کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ دنیاوی علوم ہوں یا تہذیبوں انھیں قریب لانے کا کام ترجیح کرتے ہیں۔ ترجیح کی ضرورت ہر دور میں رہی ہے شاید یہی وجہ ہے کہ ہر ملک میں ایک سے زائد زبانیں سیکھنے اور سکھانے کا رواج عام ہے۔ سائنس اور تکنالوجی کی مدد سے یہ کام اب اتنا آسان ہو گیا ہے کہ بین الاقوامی جلسوں اور قانون ساز ایوانوں میں کی جانے والی تقریر شرکاء اپنی اپنی زبان میں سن سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مشین وہ سارا کام نہیں کر پاتی جو ایک ماہر زبان کرپاتا ہے مشینوں کی حد میں مقرر ہیں انھیں دی ہوئی لفظیات کی مدد سے وہ صرف لفظی ترجمہ ہی کر دیتی ہیں۔ ہاں! یہ بات ضرور ہے کہ وقت طور پر کام نکل جاتا ہے، کوئی رکاوٹ نہیں رہتی۔ عدالت میں مقدمے کے دوران اور دو ممالک کے نمائندوں کی گفتگو کے دوران یہ کام انٹر پر یعنی ترجمان یا مفسر انجام دتے ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کی ترجمہ نگاری ہے جو اسی دعم عمل میں آتی ہے۔ یہ کام زبانی ہوتا ہے تحریری نہیں اور نہ ہی آلات کی مدد سے۔ فن ترجمہ نگاری میں مہارت کی ضرورت ہے اور مہارت صرف ریاضت سے حاصل ہوتی ہے فن ترجمہ نگاری کو تخلیقی عمل بھی قرار دیا جاتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ چند دانشوروں کے نزدیک یہ ری کریشن ہے یعنی ایک زبان میں تخلیق کی ہوئی چیز کو دوسری زبان میں از سر نو تخلیق کرنا۔

زیر مطالعہ کتاب ”عکس“ مراثی خاکوں کے اردو تراجم ہیں۔ کتاب میں شامل جملہ خاک کے مراثی کے معروف قلم کار پ۔ ل۔ دیش پانڈے کے لکھے ہوئے ہیں اور جسے محمد حسین پر کارنے اردو قابل میں ڈھالا ہے۔ خاک کے اردو ادب کے لیے کوئی نئی صنف نہیں ہے۔ اردو میں اس کا آغاز انیسویں صدی میں ہوا اور بیسویں صدی میں اس کی نشوونما ہوئی۔ بقول خلیق احمد یہ ”نشر میں غزل کافن ہے“ خاکہ نگار کردار کے ذہن سے سوچتا ہے۔ لہذا جس کسی کی خاکہ نگاری کی جاتی ہے اُس کی خارجی اور داخلی دنیا کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ کسی شخص کی

سیرت کی بہتر عکاسی وہی کر سکتا ہے جو اس کے متعلق ذاتی علم رکھتا ہو۔ عبدالحق نے ”نام دیومالی“ اور ”نورخان“ کے خاکے پیش کر کے اردو ادب کوئی سمٹ عطا کی۔ رشید احمد صدیقی کے ”کندن“، ”حسن عبد اللہ“ اور ”شیخ پیر و نیز اشرف صبوحی کے خاکے ”دلی کی چند عجیب ہستیاں“ اپنی نوعیت کے منفرد خاکے ہیں۔ تاحال خاکوں اور خاکے نگاروں کی فہرست طویل ہے۔

خاکہ نگار مصور ہوتا ہے الغرض اس کے تراشے بھروسوں میں اچھے اور بُرے سمجھی نقوش اُبھر کرتے ہیں خاکوں کو ہم عام طور پر دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ شخصی خاکے اور خیالی خاکے۔ باریک بینی سے کام لیں تو ہمیں خاکے کئی خانوں میں بٹے ملتے ہیں جیسے تاثراتی خاکے، توصیفی خاکے، کرداری خاکے، معلوماتی خاکے، مزاجیہ خاکے، طنزیہ خاکے، ذاتی خاکے یا خودنوشت۔ اردو میں بیشتر خاکے تاثراتی خاکے ہوتے ہیں اور ان میں انسائیکلوبگ نگار غالب ہوتا ہے۔

”عکس“ میں شامل خاکے پڑھ کر ہمیں مراثی قلم کاروں کے اسلوب خاکہ نگاری پر بطور مجموعی کچھ تاثر قائم کرنے میں مدد ملیکی۔ پ۔ ان۔ دیش پانڈے اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ان کا تخلیق کردہ ادب مراثی ادب میں نمائندہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں یہ کہوں تو شاید بے جانہ ہوگا کہ ایسی کوشش پہلی بار کسی نے کی ہے کہ وہ مراثی خاکوں سے اردو والوں کو متعارف کرائے۔ محمد حسین پرکار ہماری مبارکباد کے اس لیے بھی زیادہ مسحت ہیں کہ انہوں نے اس کام کے لیے پ۔ ان۔ دیش پانڈے کے خاکوں کا انتخاب کیا ہے اور ایک بہت بڑی ادبی خدمت انجام دی ہے۔ محمد حسین پرکار کیش لسانی ہیں اور اپنی ادبی کاوشوں کے لیے ادبی دنیا کا جانا پہچانا نام ہے۔ ہندستانی پر چار سجا اُن سے مختلف پروجیکٹ پر کام کروا کر اردو اور مراثی کے لین دین میں اہم روں ادا کر سکتی ہے۔ میں ”عکس“ کی اشاعت کے لیے دونوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ دنیا کے اردو میں ”عکس“ کی خوب پذیرائی ہوگی۔

## ڈاکٹر محمد اسٹق جم خانہ والا

(کارگزار صدر ہندستانی پر چار سجا)

## تاریخی دستاویز

اُردو کی طرح مراثی میں بھی مزاجیہ ادب کی اچھی روایت ہے۔ کوہنکر، گذکری، اچاریہ اترے، باندکر، براسدار، شنکر پائل، پ۔ ل۔ دلیش پانڈے یہ کچھا، ہم نام ہیں ان میں بھی پ۔ ل۔ دلیش پانڈے کا نام سرفہرست لکھا جاتا ہے۔

۱۹۳۵ء کے بعد مراثی کے طنز و مزاح میں پ۔ ل۔ دلیش پانڈے کے ڈراموں، سفرناموں، خاکوں اور مضمایں کی اپنی حیثیت ہے۔ اتمل دار، صحیح آہے ٹھیج پاشی، تی پھول رانی، یہ ڈرامے آج بھی مقبول ہیں اور مراثی تہذیب کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ پ۔ ل۔ دلیش پانڈے نے بچوں کے لیے بھی مزاجیہ ایک بابی ڈرامے لکھے جواب تک کھیلے جا رہے ہیں۔ نوے گوکل، وِھلا تو آلا آلا، وَیم موٹھم کھوٹم، یہ بچوں کے ڈرامے کافی سراہے گئے ہیں۔ اپر ورنگ، اپر واٹی، زاوے تیاچیادیشا، ونگ چترے، یہ سفر نامے مجتبی حسین کے جاپان کے سفرنامے کی مجھے یاد دلاتے ہیں۔ طنز و مزاح کے مضمایں میں مراثی ادب میں ان کا کوئی ثالثی نہیں ہے۔

گھوکیر بھرتی، کھلی، ہس و نوک، گولا بیریز، نستی اٹھاٹھیو، بٹھاٹھاچی چال، اسامی اسامی، ان عنوانوں کی کتابوں میں اپنے عہد کے سماجی، سیاسی، تہذیبی، شخصیتوں، وارداتوں، حادثوں کی باکمال منظر کشی ہے۔ جس میں زبان کا لا جواب استعمال کرتے ہوئے طنز کے ساتھ اچھے بُرے معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے۔ ہر مضمایں کا ہر جملہ پڑھ کر قاری لوٹ پوت ہو جاتا ہے۔ مہارا شتر کے ہر علاقے کی اپنی زبان کے اعتبار سے، غلط فہمیوں کے اعتبار سے عقیدوں کے بارے میں کچھ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے انکی شناخت بنی ہوئی ہے۔ پ۔ ل۔ دلیش پانڈے نے اسی کو اپنے سفرناموں، ڈراموں، مضمایں اور خاکوں کا موضوع بنایا

ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا گہرا مطالعہ، زبان پر غیر معمولی گرفت اور واحد اسلوب ان سبھی صنفِ ادب میں ان کے قلم کو کامیاب کرنے میں مددگار چاہت ہوئے۔ یہی بات ہم مشتاقِ احمد یوسفی کے مفاسیں کے بارے میں بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان انشاء، شفیق الرحمن، عظیم بیگ چغتائی کا جس طرح اردو طنز و مزاح میں اپنا ایک مقام ہے مگر پھر بھی مشتاقِ احمد یوسفی کی بات کچھ اور ہی ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہے۔ ل۔ دلیش پانڈے کے بارے میں کہا جاسکتا ہے۔

مراٹھی خاکہ نگاری میں ہے۔ ل۔ کے مقابلے میں کوئی بھی ادیب اب تک نہیں آپایا۔ اردو میں شاہدِ احمد دہلوی، منشو، ساجر کے نام میں لوں گا مگر زیادہ تر خاکے ادیبوں کے ہی ہیں۔ ل۔ دلیش پانڈے نے نہ صرف ادیب، فنکاروں کے خاکے لکھے بلکہ کچھ خاکے خیالی شخصیتوں کے بھی ہیں جن کو پڑھتے ہوئے ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان سے ہم بھی ملے ہیں، ان سے گفتگو کی ہے، ان کے ساتھ وقت گزارا ہے۔ نام چاہے کچھ اور ہو مگر یہ شخص تو ہے وہی جسے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ منشو کے خاکوں میں پری چہرہ نیم، اشوك کمار، میراجی، تین گولے، آغا حشر کا شیری یا ساجر کا لکھا ہوا دیوندر ستیار تھی، شاہدِ احمد دہلوی کا رشید احمد صدیقی یہ بھی خاکے اس قسم کے ہیں جو بھلائے نہیں بھولتے۔

پ۔ ل۔ دلیش پانڈے کی کتاب ”ویکتی آنی ولی“ میں انتوبروا، یہ کوئن کے رتنا گیری نامی شہر کا ایک خاکہ مراٹھی ادب میں بے حد مشہور ہے۔ پکار صاحب نے اس کا ترجمہ بھی بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ ”انتوبروا“ کے طرز کا وار بے حد گہرا ہوتا ہے۔ ہر چیز ہر بات پر جملے کننا اس کی عادتی ہے۔ ہر جملہ جیسے فنکارانہ انداز سے تراشا ہوا ہے وہ ماننکھا لو جی سے بھی نکلتا ہے، سیاست اور تہذیبی رنگ سے بھی نکھرتا ہے۔ اپنی زندگی میں ہے۔ ل۔ نے انسانی رہن سہن، مزاج کے جو مختلف پہلوؤں کی ہے، ان کے بر تاؤ کے پیچھے چھپی سائکالو جی کا معائنہ کیا اور ان سبھی باتوں کو ذہن میں محفوظ کر انھیں الگ الگ خاکوں میں ڈھال دیا۔ معاشرے کی بے وقوفیاں، دکھاوا، خود غرضی، خودداری، ایگو جیسی کئی خامیوں پر طنز کرتے ہوئے اپنے خاکے مکمل کیے۔ لفاظی، کنش اور سی، اینٹی کلائیکس، پیر و ڈی جیسی کئی باتوں سے ان کے قلم سے زندہ خاکے، مفاسیں ہمیشہ قابل تعریف بن گئے ہیں۔ ”انتوبروا“، ”سکھارام گئے“، ”نند اپر دھان“ یہ خاکے فرضی ہیں

جیسے امتیاز علیٰ تاج کا ”چاچا چھکن“، مشاق احمد یوسفی کا ”میر صاحب“ وغیرہ کردار ہیں۔ مگر پ۔ ل۔ دیش پانڈے نے ”وودہاؤس“ (انگریزی مزاجیہ ادب کے شہنشاہ) پچ۔ تریہ۔ کھانولکر (مراٹھی کے ایک ذہین ڈرامہ نگار، ناول نگار اور شاعر) ”راو صاحب“ (ایک مراٹھی نگیت ڈراموں کا شو قین) اور پ۔ ل۔ کے سُرال کے ایک بزرگ شخص ”رُگ ویدی“ کے خاکے یہاں پر کار صاحب نے اردو قاری کے لیے پیش کیے ہیں۔ خود پر کار صاحب کو کون کے باشندے ہیں۔ اردو مراٹھی پران کی یکساں گرفت ہے۔ گھروں میں کوئی مراٹھی کا وہ استعمال کرتے ہیں۔ مہارا شتر سنکرتی کا حصہ ہونے کے ناطے پ۔ ل۔ دیش پانڈے کا اعلیٰ ادب یقیناً اسکو لی زمانے سے اُن کے پڑھنے میں آیا ہے۔ اسی لیے اس کام کے لیے اُن سے بہتر کوئی اور مجھے دکھائی نہیں دیتا۔

پ۔ ل۔ کے لکھے شاہ کار خاکوں میں ”پیسم جی“، ”نامو پریث“، ”باپو کانے“، ”نارائن“۔

”بیڑو“، ”انٹر نیشنل دیکٹیشن“، ”بھتیانا گپور کر“۔ ایسے کئی نام گنوائے جاسکتے ہیں۔ پھر اس کتاب میں مترجم نے جو خاکے پیش کئے ہیں وہ بھی اتنے ہی نمائندہ خاکے ہیں۔

جناب محمد حسین پر کار مراٹھی ماحول میں پلے اور بڑے ہوئے۔ مراٹھی سے انھیں بیحد لگاؤ ہے۔ نور پر کار جو مراٹھی اردو کے معتبر مترجم مانے جاتے ہیں وہ ان کے سلے بھائی ہیں۔ ادبی لین دین یا آدآن پرداں میں اس خاندان کا نام لینا ضروری ہو گیا ہے۔ نور پر کار کے کام سے متاثر ہو کر کئی اردو والے ترجمے کی اور مرڈے اور مترجم کا عبده پا گئے۔ محمد حسین پر کار میں ترجمہ کرنے کی صلاحیت نور پر کار کی طرح ہی ہے۔ ایک بار میں نے انھیں پ۔ ل۔ دیش پانڈے کے خاکوں کے مجموعے دکھا کر اُن کا اردو میں ترجمہ ہونا ضروری ہے ایسا کہا تھا اور انھوں نے بھی شدت کے ساتھ یہ چیلنج قبول کرتے ہوئے چند مہینوں میں یہ شہکار کام انجام دیا۔ یہ خاکے مراٹھی سے سیدھے سیدھے اردو میں ہوئے ہیں۔ اس طرح فلم لینگو ٹچ ہندی یا انگریزی کے ہنا اور یجنل زبان مراٹھی سے اردو میں ترجمہ کرنے کی قابلیت رکھنے والے بہت کم لوگ مہارا شتر میں ہیں۔ ان میں ڈاکٹر عبدالستار دلوی، اگاسکر بر درس، سلام بن رزا ق، یعقوب راہی، وقار قادری، ڈاکٹر اسد

اللہ، قاسم ندیم ایسے کچھ نام ہیں ان میں محمد حسین پرکار کا بھی نام اب شامل ہو گیا ہے۔ جس طرح جی۔ اے۔ گلگرنی کے افسانوں کو مراثی سے اردو میں لانے کی جرأت صرف سلام بن رزاق کر سکے اُسی طرح (مراثی کے منتخب افسانوں کے کئی مجموعے اب تک شائع ہوئے پر عظیم افسانہ نگار جی۔ اے۔ گلگرنی کی کہانیوں کو ہوائے ان کے کسی نے ہاتھ نہیں لگایا) پ۔ ل۔ دیش پانڈے کے خاکوں کو بھی پرکار صاحب کے ہوا کوئی ترجیح کے لیے لئے نہیں پایا۔

جو ترجمہ اور بخشنی زبان سے ہواں کی اہمیت سب سے زیادہ ہے اور وہی قابل اعتبار ہے اس بات سے میں قطعی انکار نہیں کرتا مگر دوزبانوں کو سیکھنے والوں کی گھٹتی تعداد مراثی اردو میڈیم کے اسکولوں میں گھٹتے ہوئے کلاس س کو مدد نظر رکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ فلٹر لینگو ٹچ یا انک لنگو ٹچ ہندی کا سہارا لینا وقت کا تقاضا ہے دنیا بھر کا ادب ہماری علاقائی زبانوں میں انگریزی کے ذریعے پہنچتا ہے اور ہر ملک میں انگریزی فلٹر لینگو ٹچ کا رول ادا کر رہی ہے۔ پ۔ ل۔ دیش پانڈے کی ساری تخلیقات ا کیلئے پرکار تو نہیں کر سکتے اور اگر مراثی سے سیدھے اردو میں ترجمہ کرنے والے پرکار ہمارے یہاں دوچار ہی ہیں تو کیوں نہ ہم ہندی کی مدد سے بچا ہوا ترجمے کا کام پورا کریں؟ مراثی اردو ترجمے کی تاریخ میں پرکار صاحب کا یہ کارنامہ یقیناً درج ہو گا اس میں مجھے کوئی شبہ نہیں۔ اس تاریخی دستاویز کے لیے مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر اور جناب محمد حسین پرکار صاحب کو میں مبارکباد دیتا ہوں۔

## ڈاکٹر رام پنڈت

عکس

## عکس --- زیر عکس

مراٹھی ادب کی منتخب کہانیوں، شعری تخلیقات اور ڈراموں کے تراجم کے بعد ادب کی ایک اور اہم صفت خاکوں کی جانب مڑا ہوں۔ وہ بھی پ۔ ل۔ دلیش پانڈے کے لکھے خاکوں کی طرف پ۔ ل۔ دلیش پانڈے کی تخلیقات مراٹھی ادب میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ میں ان کے ڈرامے کالج کی طالب علمی کے زمانے سے دیکھتا آیا ہوں۔ اتوار کے دن جب دارالاقامہ میں رہنے والے کالج کے ساتھی طلبہ اپنی شب بیداری کی وجہ سے عام طور پر دیرے سے اٹھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ میں اور میرے چند ڈراموں کے شوقین احباب جو گیشوری سے سیدھے بھارتیہ دیا بھون ٹھیک ۱۹ بجے صبح پہنچ جاتے اور عن گھنٹے مسلسل قہقہوں میں اور انوکھے لطف اندوز ماحول میں گزارتے۔ مراٹھی ڈراموں کا اپنا ایک خاص انداز ہے۔ ڈرامے لکھنا، پڑھنا اور دیکھنا یہ ان کی ترجیھات میں سے ہے۔ پ۔ ل۔ دلیش پانڈے ہمارے کالج اسماعیل یوسف کالج کے سابق طالب علم تھے لہذا ان سے اور ان کے ادب سے ایک خاص اپناست تھی ہمیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہم جو گیشوری سے چوپائی بھارتیہ دیا بھون پہنچ جاتے تھے۔ اکثر اوقات ڈراموں میں مکالموں کا طنز و مزاج اتنا بھل ہوتا کہ وہ مزاحیہ نقرے اور طنزیہ جملے برائے راست تماشا یوں میں موجود آس پاس کے لوگوں پر پخت ہو جاتے اور ہمارا لطف دوتا ہو جاتا۔ ڈراموں کے شوہر میں نہ جانے کتنی ساری خوبیاں نظر آتی ہیں۔ اس دوران ہمارے پڑوس میں بیٹھے نوجوان جوڑے ایک دوسرے کی طرف بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

ہوں تو ہماری خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہتا۔ پھر کسی منظر میں یوں اپنے شوہر سے کہہ رہی ہے ہو کہ دیکھو بچہ مسلسل روئے جا رہا ہے اور میں ڈرامے کا ذرا بھی لطف نہیں لے پا رہی ہوں ذرا اسے باہر لے جا کر بہلا تو لا اور اسی اشناپ۔ ل۔ دلیش پانڈے اس طبق پر وہی فقرے دو ہرار ہے ہوں تو کیسا عملی روپ ہمیں دیکھنے ملتا۔ ایسے لمحات بھلائے نہیں بھول پاتے ہم۔ پ۔ ل۔ دلیش پانڈے کا مشاہدہ، اسے ڈرامے میں پیش کرنے کا طریقہ اور ہنا رکاوٹ تین گھنٹوں تک مختلف کرداروں کے مکالمے ٹھیک ان کرداروں کی آواز میں پیش کرنا صرف پ۔ ل۔ دلیش پانڈے کا حصہ تھا اسے ماننے سے کوئی بھی انصاف پسند قاری اور تماثلی انکار نہیں کر سکتا۔

ہم طلبہ ساتھیوں میں اس بات پر ضرور بحث ہوتی کہ آخر پ۔ ل۔ دلیش پانڈے بارش کے تین مہینوں میں کیوں کر نیا ڈرامہ لکھ پاتے ہوں گے اور باقی کے ۹ مہینوں میں اپنے لکھے ڈرامے کے انگنت شوکر تا اور کامیابی سے کرنا ان کے لیے کیوں کر ممکن ہوتا ہوگا۔ حق یہی ہے۔ ایسا ادیب، ڈرامہ نویس، اداکار، ناول نگار، خاکہ نویس، طنز و مزاح نگار صدیوں میں پیدا ہوتا ہے اور وہ صدی اُس کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔

پ۔ ل۔ دلیش پانڈے کی تحریر میں جو گیشوری کا ذکر ملتا ہے۔ انہوں نے اسماعیل یوسف کالج اور کالج سے قریب بنی رہائشی سوسائٹی کا ذکر کیا ہے جہاں وہ رہا کرتے تھے۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ انہوں نے جن افراد کا ذکر کیا ہے ان سے ملنے اور انہیں قریب سے جانے کا موقع بھی مجھے نصیب ہوا۔ ڈاکٹر سلگر کے گھر میرا آنا جانا بھی رہا ہے۔ ان کا ایک بیٹا اور ان کی بیٹی اُسی دوران کالج میں پڑھتے تھے لہذا ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ یوں بھی اسماعیل یوسف کالج کے طلبہ اور اساتذہ سب کا ایک دوسرے کے ساتھ رشتہ ایک خاندان کے افراد جیسا تھا اور آج بھی برقرار ہے۔

الغرض پ۔ ل۔ دلیش پانڈے کا تخلیق کردہ ادب میرے مطالعہ میں رہا اور اُس سے میں کافی متاثر ہوا۔ ان کے خاکوں کا انداز بالکل ہی منفرد ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے ان کی اپنی ایک الگ پہچان ہے۔ ایک روز محترم ڈاکٹر رام پنڈت صاحب سے اردو۔ مراثی کے آدآن پر دان پر بحث ہو رہی تھی۔ انہوں نے دورانِ گفتگو کہا کہ پ۔ ل۔ دلیش پانڈے کے خاکے اردو میں منتقل ہو جائیں تو ایک بہت بڑا ادبی کارنامہ ہوگا۔ میں نے یہ ذمہ داری قبول کر لی اور اسے پوری کرنے میں جُٹ گیا۔ انتو برواجیسے کردار میری

آنکھوں کے سامنے گھونٹنے لگے۔ انتو بروار تنا گیری شہر کا ایک کردار ہے۔ میں خود رتنا گیری ضلع کا باشندہ ہوں۔ میرا آبائی گاؤں بانکوٹ ہے جو رتنا گیری ضلع کے منڈن گڑھ تعاقدہ میں واقع ہے لہذا انتو بروار جیسے کردار میری آنکھوں کے سامنے سے ہو گزرے ہیں۔ میری تعلیم اردو میڈیم سے ہوئی لیکن جماعت دسویں تک مرائھی میرا ایک مضمون رہا ہے۔ مرائھی اخبارات کا مطالعہ، مرائھی میں خط و کتابت یہ معمول میں شامل تھا۔ گھر میں کوئی کے استعمال، مرائھی تہذیب و تمدن سے واقفیت نے میری نصف سے زائد مشکل حل کر دی اور تراجم میں یہ باتیں میرے لیے معاون و مددگار ثابت ہوئیں۔ مرائھی اور ہندی دونوں کا رسم الخط دینا گری ہے۔ اردو زبان کے اعتبار سے ہندی سے کافی قریب ہے اس کے باوجود پڑھنے میں مجھے ہندی لقیل اور غیر مانوس سی معلوم ہوتی ہے اور مرائھی پڑھنے میں ایک گونہ اطف آ جاتا ہے۔ مرائھی کا ادب، اُس کی لفظیات اور اس کی ساری فتنی باریکیاں جانی پہچانی لگتی ہیں لہذا مرائھی ادب کو اردو میں منتقل کرتے ہوئے کہیں دشواری بھی آجائے تو اس پر بار بار غور کرنے سے اس کا حل نکل آتا ہے اور ترجمہ سو فیصدی اطمینان بخش نہ ہو اتب بھی یہ اعتماد برقرار رہتا ہے کہ دونوں زبانوں کی روح کو مجرور ہونے نہیں دیا ہے اور ثالث کارول بخوبی نبھایا ہے۔

”انتو بروا“ کا کردار جانا پہچانا کردار ہے۔ رتنا گیری ضلع کے باشندے بے حد ذہین اور حاضر جواب ہوتے ہیں۔ ان کی جس مزاج بہت تیز ہوتی ہے۔ ان کے پاس کسی بھی سوال کا جواب، کسی بھی مسئلہ کا حل موجود رہتا ہے۔ ان خوبیوں کے ساتھ قدرت نے انھیں انسانی پیار کا بیش قیمت ورثہ عطا کیا ہے۔ یہ پیار اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب وہ اپنی عمر کے آخری مراحل میں ہوتے ہیں۔ پ۔ ان۔ دلیش پانڈے کی زبان میں کہیں تو وہ کھل کی طرح باہر سے سخت اور اندر سے نرم و شیریں ہوتے ہیں۔ ان کی یہ خوبی کھل کی طرح بہت زیادہ پک جانے (معمر ہونے) پر ظاہر ہوتی ہے۔

”سکھارام گئئے“ کا کردار بھی انجاناتا کردار نہیں ہے۔ ایسے اشخاص ہمیں جا بجا ملتے ہیں جو ادبی دنیا میں کھوئے رہتے ہیں اور عام انسانوں سے مختلف طرز کی زندگی گزارتے ہیں۔ ان کی زندگی میں تصنیع زیادہ ہوتا ہے یہی ان کی شناخت بھی ہے۔ ایسے لوگوں کی اکثریت کا یہ شرط ہے ان لوگوں سے بھرا پڑا رہتا ہے جونہ ہی ادیب و شاعر ہوتے ہیں اور نہ ہی اعلیٰ تعلیم یافتے۔ البتہ ادبی کتابوں کے مطالعہ اور ادبی محفوظوں میں

آن کی موجودگی انھیں ادبی لبادہ اوڑھ کر چلنے کے گر سکھاتی ہے۔ آن کے نے ملے جملے سن کر اساتذہ ادب اور دانشور جنجنھلا اٹھتے ہیں اور بیزار ہو جاتے ہیں لیکن اظہار نہیں کر پاتے کہ حدا ادب کا یہی تقاضا ہے۔

”راو صاحب“ کا کردار بھی کوئی انوکھا کردار نہیں ہے۔ ناٹک کے دلدادہ اور موسیقی کے شالقین کو قریب سے دیکھئے کہ وہ کس قدر حساس ہوتے ہیں۔ ان فنون سے جڑے ہوئے افراد سے یعنی فنکار سے ذرا سی بھی غلطی ہو جائے تو وہ راو صاحب جیسے لوگوں کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ وہ فنکار کوٹوں نے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرتے۔ ہاں! صحیح روشن پر اپنا رول ادا کرتے ہیں اُن پروہ جان چھڑ کتے ہیں۔ آن کی یہی خوبی آن کے لیے بہت سے قدر دان پیدا کرتی ہے۔ وہ بے حد دوست نواز ہوتے ہیں۔ کبھی کسی اختلاف کی وجہ سے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی نوبت آجائے تب بھی حق دوستی ادا کرنے سے باز نہیں آتے۔ آن کا کہنا ہوتا ہے کہ کورٹ کا معاملہ الگ چیز ہے اور دوستی الگ۔ عدالت اپنا فصلہ نائے گی لیکن اس سے ہماری دوستی میں فرق کیوں آئے۔

”کھانو لکر“ کا خاکہ ہمیں فن و ادب سے مسلک آن شخصیتوں کی یاد دلاتا ہے جو عام روش سے ہٹ کر ادب کی کسی ایک صنف میں اپنا مقام بنایتے ہیں اور اسی اسلوب و نجی پر دوسری صنف میں طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن ابھی نظر کے نزدیک ان دونوں میں توازن نہیں ہوتا۔ ایک کمزور دوسری کامیاب تخلیق لگتی ہے اور وہ تخلیق کارکو الجھن میں پھنسا ہو اپاتے ہیں۔ انھیں تخلیق کار کے ساتھ ہمدردی ضرور ہوتی ہے لیکن وہ اس کا اظہار بھی نہیں کر پاتے جس کا انھیں داعی دکھ بھی رہتا ہے۔ بہر حال ایسے تخلیق کار ادب پر اپنی کچھ چھاپ ضرور چھوڑ جاتے ہیں۔

”وڈ ہاؤس“ بحیثیت مزاج نگار ہیں الاقوامی شہرت کا حامل ہے۔ پ۔ ل۔ نے (پ۔ ل۔ دیش پانڈے کو مراثی ادب میں اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے) وڈ ہاؤس کا کردار اتنی خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ اُس کے ادب، اُس کی زندگی، اُس کے جس طنز و مزاج کی منہ بولتی تصویر آنکھوں کے سامنے اُبھر آتی ہے ایسے انسان سخت سے سخت مصیبت کا بڑی دلیری سے مقابلہ کرتے ہیں اور مصیبت کے دنوں کا ذکر بھی ایسے انداز سے کرتے ہیں مانو وہ مصائب کا مضائقہ اڑا رہے ہوں۔ ایسے لوگوں سے تکالیف خود ہار تسلیم کر لیتی ہیں

وہ لوگوں کے لعن و طعن پر غالب کی طرح ہنتے ہیں کہ ان کم ظرف لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ عمر کے اس حصے میں کیسی دشناام اور کیسے لعن و طعن طبعیت پر گراں گزر سکتے ہیں۔

”ندا پر دھان“ کا خاکہ اپنے کی زندگی کا خوبصورت نقشہ پیش کرتا ہے۔ ایسے جیا لے اور خوب رہ انسان کا لمحہ کی زندگی اور باہری زندگی میں خوب رنگ جاتے ہیں۔ کا لمحہ میں حاصل کی ہوئی تعلیم اور سو شل درک سے پایا ہوا تجربہ، ذرا مے کھیلتے کھیلتے ڈراموں کے کرداروں سے ملا ہوا زندگی گزارنے کا سلیقہ میدان عمل میں قدم رکھنے کے بعد بہت کام آتا ہے یہ ندا پر دھان کے خاکے سے واضح ہو جاتا ہے۔ وہ اپنا غم چھپانا جانتا ہے۔ دنیا کو باز پہنچا اطفال جان کر شب و روز ہونے والے تماشے اس طرح نظر انداز کر دیتا ہے کہ اس کی اپنی شبیہہ ابھر کر اپنے انم نقشہ چھوڑ جاتی ہے۔

”رُگ ویدی“ کی تصویر میں اسلاف کے اعلیٰ اقدار کی داستان پوشیدہ ہے۔ ایسے افراد سماج کا ایک اٹوٹ حصہ ہوتے ہیں اور ان کے چل بنے کے بعد ایک نامعلوم ساخلا، چھوڑ جاتے ہیں ایسے لوگوں کی قدر اپنے وقت میں کم اور عدم موجودگی میں زیادہ ہوتی ہے۔ گھر کے افراد، خویش و اقرباء انھیں اس وقت یاد کرنے لگتے ہیں جب دوسرے ان کی خدمات کو سراہت ہوئے ان کی زندگی کے بارے میں جانے کی خواہش کرتے ہیں۔ بہر حال انسان اپنے کاموں سے زندہ رہتا ہے

تمھاری نیکیاں زندہ تمھاری خوبیاں باقی

پ۔ ان کے لکھے خاکوں کا ترجمہ کرتے ہوئے مجھے کئی مراحل و تجربات سے گزرنی پڑا۔ ان کا تحریر میں اعلیٰ ادب، مائی تھالوجی، سماجی اقدار، مقامی زبان کی چاشنی، وہاں کی آب و ہوا، پیداوار غرض ہروہ چیز آتی ہے جہاں کا وہ کردار پیش کر رہے ہیں۔ ان کا اظہر و مزاج الگ نوعیت کا ہوتا ہے۔ قوسین میں وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ کافی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ لہذا ان کی تخلیقات کا ترجمہ کرتے وقت جہاں کچھ کچھ مشکلات سے گزرنی پڑا وہیں اپنے علم میں کچھ اضافہ بھی ہوا اس کا اعتراف کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ترجمہ کرنے میں کوئی خامی، کوئی غلطی، کوئی نقص رہ نہ جائے اس لیے جہاں کہیں کوئی لفظ، کوئی کی فقرہ میری سمجھے میں نہیں آیا اس کی ہر ممکنہ طریقے سے معنی و وضاحت حاصل کی اور اپنی معلومات میں اضافہ کر لیا۔ ان

کوششوں کے باوجود میرا ترجمہ جملہ نقائص سے پاک ہے ایسا میں نہیں کہہ سکتا۔ میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ یہ قابل قبول ترجمہ ضرور ہے البتہ میرے دل میں کم کسی باقی ہے کہ اس سے بہتر ترجمہ ہو سکتا تھا اور اسی کم کو میں اپنی کامیابی کا ضامن سمجھتا ہوں۔

میں شکرگزار ہوں مالکِ دو جہاں کا اور احسان مند ہوں اس کی بے پناہ عنایتوں کا کہ یہ پروجیکٹ پائے تکمیل کو پہنچا سکا۔

میں ممنون و مشکور ہوں ”موج پر کاشن گر ہے“، کھناؤ و اڑی، گرگاؤں، ممبئی۔<sup>۲</sup> اور پ۔ ل۔ دیش پانڈے فاؤنڈیشن بھائڈار کر رہا، پونے۔<sup>۳</sup>، کاجھوں نے مجھے بخوبی ترجمہ کرنے کی اجازت عطا کی۔

میں ہندستانی پر چار سجھا کی منظمه کمیٹی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے ان خاکوں کو شائع کر کے اس ادبی کوشش میں میری ہمت افزائی کی۔ میں محترم ڈاکٹر محمد اسحاق جنخانہ والا صاحب، کارگزار صدر ہندوستانی پر چار سجھا کا بے حد ممنون و مشکور ہوں کہ انہوں نے حرف آغاز لکھ کر میری کوششوں کے سراہا ہے اور اپنی نیک خواہشات سے نوازا ہے۔ میں ہندستانی پر چار سجھا کی اعزازی سیکریٹری محترمہ کو حافظ کا صاحب کا بے حد شکرگزار ہوں کہ انہوں نے ہمیشہ کی طرح میری اس کتاب کی اشاعت میں بے حد دلچسپی لی اور کورڈ زائن تیار کروانے میں بھی پیش پیش رہیں۔ میں پرنسپل پریما نند گود کیر صاحب، اعزازی خازن ہندستانی پر چار سجھا کا بے حد مشکور و ممنون ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی تیاری میں ہر مرحلے میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور اپنی ولی مسرت کا اظہار کیا۔

میں اپنے عزیز دوست ڈاکٹر رام پنڈت کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے پیش لفظ لکھ کر اس کتاب کی اہمیت کو دو بالا کر دیا ہے۔

میرا اپنے ساتھیوں عزیز دمُس یا سمین شیخ سلمہ اور عزیزی آصف پٹھان سلمہ کا شکریہ ادا نہ کروں تو یہ نا تسلکرگزاری ہو گی جو ہمیشہ میری تخلیقات کی اشاعت اور میری ادبی خدمات میں میرے شانہ بہ شانہ کھڑے رہتے ہیں۔

میں جناب منوہر مانڈاڑ کا بے حد منون و مشکور ہوں جنخوں نے ترجیح کی اجازت حاصل کرنے میں میرے ساتھ بھر پور تعاون کیا اور مجمعہ دبار میرے ساتھ "مون پر کاشن گرہ" تک تشریف لے آئے۔

میں اپنے دوست جناب اشتیاق سعید کا بے حد شکر گزار ہوں جن کا ذی فی پی، کورڈ زائن کی تیاری اور طباعت کے مراحل میں نہ صرف بھر پور تعاون حاصل رہا بلکہ ادبی خدمت کا جذبہ بھی کارفرما رہا۔

میں اپنے قارئین کا بھی بے حد منون و مشکور ہوں جو اس کتاب کی اشاعت کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ لیجئے انتظار کی گھر یا ختم ہو چکی ہیں۔ کتاب حاضر خدمت ہے۔ اب اس میں کمی بیشی کی نشاندہی کرنا آپ کی ادبی ذمہ داری ہو گی۔

محمد حسین پرکار

۲۱ جنوری ۲۰۰۵ء

## نند اپر وھاں

فرنچر کی دو پہر آفس چھوٹا۔ فورٹ سے میں گھوتتے تھا۔ گھڑیاں کی ایک دکان کی نمائش کھڑکی کے سامنے کھڑے رہ کر کاٹج کے پیچھے ترتیب دی ہوئی گھڑیوں کو میں دیکھ رہا تھا۔ انگریزی میں اسے ”ونڈو شاپنگ“ کہتے ہیں۔ بڑی بڑی ڈکانوں میں نہایت پرکشش طریقے سے بیچنے کی چیزیں بڑے سلیقے سے لگائی ہوئی رہتی ہیں۔ اکثر قیمت کا لیبل انداز کر کر رکھا ہوتا ہے۔ وہاں کی سب سے پسندیدہ شے کی سب سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ پیچھے ایکبار ایک دکان کی کاٹج کے پیچھے رکھی ہوئی نائی میں نے دیکھی وہ نائی مجھے اچھی لگی۔ شاید وہ اتنی خوبصورت نہ بھی ہو، کیونکہ وہ اس کاٹج کے پیچھے بہت دنوں سے تھی۔ ایک دن ہمت کر کے میں اس دکان میں داخل ہوا اور اس نائی کی قیمت معلوم کر کے باہر نکل آیا۔ نائی کی قیمت تمیں ۳۰ روپے ہو سکتی ہے یہ جان کر میرا گلا روندھ گیا۔ اب وہ گھڑیاں دیکھتے وقت بھی میری کلائی پر کوئی اچھی لگے گی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ خواہ مخواہ ہی۔ سچ کہا جائے تو کلائی پر جچنے سے زیادہ جیب کی برداشت کا مسئلہ اہمیت کا حامل تھا۔ اس کے باوجود مدنہی میں اس شوکیس کی ساری گھڑیاں اپنے ہاتھ میں چڑھا کر دیکھ لیں۔ یوں تو میں نے سوٹ بھی چڑھا لئے ہیں۔ فرنچر کی دکان کے مختلف فرنچر پر میں بیٹھا ہوں۔ ممنہی میں وہاں بھری بھری گدے یوں والے پلنگ پر لیٹا ہوں۔ ایک دوسرا روپیوں کا ریڈیو خریدنے کے لئے ہمیں پنج سالہ منصوبہ تیار کرتا پڑتا ہے.....! ڈوبولی تابوری بندرتک فرست کلاس میں سفر کرنے کی خواہش آج تک پوری کرنے کا موقع نہ آسکا میرے لیئے۔ میر کاٹج سے اسی طرح گھڑیاں دیکھتے کھڑا تھا۔ نہ کہوں تب بھی ممنہی

من میں اداس ہو رہا تھا۔ اتنے میں میرے کندھے پر کسی کا باتھ پڑ گیا، اور آواز آئی ” ہلو، میں ایک قدم گھبرا کر پچھے مڑا۔

” نندا! ہاں نندا..... نندا، ہی تو.....“

” بھلا نہیں ہے تو!“

نندا کو ایک جھلک دیکھنے والا بھی نہیں بھولے گا۔ یہاں تو میں نے چار سال کا لج کے اس کے ساتھ گذارے تھے۔ میں تو کیا بلکہ ہمارے کا لج میں اس وقت پڑھنے پڑھانے والے کوئی بھی اسے بھول نہیں سکے ..... لیکن آج لگ بھگ میں سال بعد ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ لڑکیاں تو اس سے خوش تھیں ہی، لیکن کا لج کے سارے ہی لڑکے بھی خوش تھے .....! نندا پر دھان یہ نام ہم گیری کو پر، فریڈرک مارچ، ڈک پاؤیل، رومن نوھیارو، ان ناموں کے ساتھ لیا کرتے تھے۔ دیوالی کرمس کی چھینیوں میں اپنے ہائل کے کمرے میں رہنے والا نندا پر دھان ! کا لج کے انگریزی ڈراموں میں پارسی اور کرپچن لڑکے لڑکیوں کے گروپ میں کام کرنے والا نندا پر دھان۔ میں بی۔ اے میں تھا، اس وقت نندا نے ہیملیٹ کا روپ ادا کیا تھا۔ اس کے بعد میں نے برٹش رنگ بھومی کا ہیملیٹ بھی سینما میں دیکھا۔ لیکن ذہن میں نندا کا ہیملیٹ پٹکا بیٹھ گیا ہے۔ اتنا شیرین ہیملیٹ! فرینی۔ کلات والا او فیلیا تھی۔ نندا فرینی سے بیاہ کریگا۔ یہ افواہ تک ان دونوں گشت کر رہی تھی البتہ نندا کے بارے میں ایسی افواہیں ہر دو ماہ بعد اٹھا کرتی تھیں۔ مجھے لگتا ہے کا لج کی سب سے خوبصورت لڑکی کے ساتھ نندا کی شادی ہوا۔ ایسی ہر کسی کی خواہش ہوگی۔ اس ضمن میں کا لج کے دیگر خواہشند حضرات نے نندا کو اسپورٹس میں اسپرٹ سے واک او وہر دے دیا تھا۔

لگ بھگ پونے چھ فٹ اونچا، ڈبل اپٹلا، نیلی آنکھوں والا، چھوٹے سے پتلے ہونٹوں والا، گھونگھروالے بالوں والا نندا پہلی نظر میں ہندو لڑکا معلوم ہی نہیں ہوتا تھا اس پر وہ انگلش بولنے والے کا سمو پوٹین گروپ میں رہتا تھا! دراصل اسکی اور میری کا لج کی دوستی کسی طرح جنم گئی۔ وہ بھی اس لمحے تک میرے لیئے معتمہ سے کم نہیں ہے۔ انگلش آنرز کی کلاس میں ہم سات آٹھ لڑکے لڑکیاں تھے اُن میں مکمل دلیکی میں تھا اور اندو ویلنکر نام کی لڑکی۔ اردو مگدھی میں جانے والی یہ لڑکی انگریزی کی کلاس میں محض فارم

بھرنے کی غلطی کی بناء پر بینہ رہی ہوئی ایسا میرا خیال تھا۔ نوگز والی سازی، جڑا، ہاتھ پر مردوں کے باندھنے جیسی بڑی گھڑی، ہاتھوں میں کتابوں کا بوجھ اور منگل گوری کے رت جگے سے آئی ہوا یہی نظر آنے والی یہ پاگل سی لڑکی جب انگریزی کے امتحان میں یونیورسٹی کے سارے انعامات لے گئی تب ہم اپنی گردان جھکائے اُسے مبارکباد دینے اُس کے گھر گئے تھے! درحقیقت کسی لڑکی کے گھر جا کر مبارکباد دینے کی مجھ میں بہت نہیں تھی، لیکن نندامیرے کمرے پر آیا تھا ان دنوں میں بھکار دا اس ماروتی کے پاس چال میں ایک کمرہ لے کر رہا کرتا تھا۔ اس دور کے پونے میں چار روپوں کے کرائے میں جن سہولتوں کے ساتھ کمرہ ملا کرتا تھا، اس کمرے میں میں اور ارگزے نام کا ایک پارٹنر ہتھے تھے۔ وہ شب و روز فلوٹ بجا یا کرتا۔ پھر اس کا اور مالک کا جھگڑا ہوتا۔ میرے اس کمرے پر ندا آنے پر مجھے شرمی محسوس ہوتی۔ تار پر میرا گھر پر دھویا ہوا پا جامد اور پھٹا ہوا بنیان، شرث وغیرہ سوکھتے پڑا رہتا۔ ارگزے نے ایک پرانا چائے کا باکس حاصل کر کے اُسے اپنی نشت بنالیا تھا۔ اس پر بینہ کروہ فلوٹ کاریاض کرتا تھا۔ خوب بجا تھا، مگر بعد میں اسے پلوری ہو گئی۔

میرے کمرے میں ان بیکار سی دیواروں کے نیچے اور گرہن کے دن دان کرنے لائق کپڑوں کے درمیان.....  
.....نندا کھڑا تھا۔

" ہمیں جانا ہے " ندانے کہا۔

" کہاں؟ "

" اندو ویلنکر کے یہاں چل "

اس طرح عجیب سی مختصری توڑ توڑ کر زبان میں بات کرنے کی اُس کی عادت تھی۔ آواز میں بھی اونچا پن تھا پر سخت نہ تھا، ایسا کچھ تھا۔ اُس پر ہر چیز اچھی لگتی اُس طرح آواز بھی اس پر چھنے والی تھی۔ ندا ایک بار گانے کے پروگرام میں میرے ساتھ نہرو شرث اور پا جامد پہن کر آیا تھا۔ وہ اس لباس میں بھی اتنا خوبصورت نظر آرہا تھا کہ بوانے گاتے گاتے ایک بار اسے نمکار کر دیا تھا۔ اُس روز وہ کمرے پر آیا تو میں بالکل اُڑ بڑا گیا۔ کچھ لوگ جنم سے ہی ایسا کچھ تج لیئے آتے ہیں کہ اس کے آگے میں میں کی رٹ لگانے والے بے بس ہو جاتے ہیں۔ کچھ عورتوں کا حسن بھی ہمیں محور کر دیتا ہے۔ ان کے سامنے ہم چھوٹے

عکس

چھوٹے سے طفل کی مانند ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے۔ نندا میں یہ جادو تھا۔ مجھے یاد آتا ہے ہمارے پرنسپل صاحب بھی جیم خانہ کمیٹی کی میئینگ میں نندا کی باتیں بغور سنتے تھے۔ وہاں بھی نندا اس طرح نوئے نوئے جملے کہا کرتا تھا، لیکن انگلش میں! تین چار لفظوں سے زیادہ بڑا جملہ نہ ہوتا تھا۔ اس دن بھی ہمیں جانا ہے، اتنا ہی کہہ دیا تھا۔ میں نے ”کہاں!“ کہنے پر ”اندو ویلنکر“ اُس نے جواب دیا۔

”اندو ویلنکر“

”مبارک باد دینے“

”اس کے گھر؟ ارے اس کا بوزہا، بہت عجیب قسم کا ہے کہتے ہیں؟“

”رہنے دے! میں بھی ہوں چل“

”ٹھیک ہے، تو ذرا گیلیری میں کھڑا رہ، میں کپڑے بدلتا ہوں“ ہمارے محلے میں کئی ایک دشوار یاں تھیں۔

”پھر میں باہر کس لئے؟“

اس آٹھ بائی چھ کے ڈربے میں کونے میں مجھ سے جتنا ممکن تھا منہ پھرائے میرا اکلوتا پانچاہمہ پہن لیا، اس میں شرٹ ٹھوس دیا اور نکل پڑے ہم۔ اندو ویلنکر کا واڑا اس کی انگلش کے علاوہ اس کی ہر چیز کے لیے موزوں تھا۔ گلی کے منہ کے پاس، قلعی والے پینڈے سے اندر رہتے ہیں، ایسا ایک سیدھی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے ہاتھ نکالا ہوا بورڈ تھا۔ نیچے کسی پونے والی گلیوں کے پروردہ ابلیس لڑ کے نے چاک سے

”لیکن قلعی راستے میں بیٹھ کر کرتے ہیں“ لکھ دیا تھا۔ کچھ لوگ کہاں رہتے ہیں یہ بلا وجہ ہی ہمیں معلوم رہتا ہے۔ اندو ویلنکر اس کی ایک مثال۔ ایک بار کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ قلعی والے پینڈے سے کی گلی میں اندو رہتی ہے۔ اسی گلی سے میں گزرتے وقت دہنیز اور سیرھیوں پر بیٹھی ہوئی عورتیں اور بچے گردن موز کرندا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اتنے خوبصورت مرد کے پاؤں کبھی اس گلی کو لگئے نہ ہوں گے! بستی سے جب پر بھو را پھندر جائے سزا کی طرف جا رہے ہوں گے تب بھی قوم کی عورتوں نے انھیں اسی نظر سے دیکھا ہوگا۔ گلی ختم ہوتے ہوتے ج گو۔ ویلنکر، ری۔ اے۔ اسیکڑا ایسی ایک تختی نظر آئی۔ ہم اندر گئے۔ دروازے کے باہر ایک رستی ننک رہی تھی رستی کھینچنے ایسی ہدایت درج تھی۔ اس مطابق ہم نے وہ کھینچنے۔ پھر اندر کی جانب کہیں

بھی کچھ کھڑا ایا اور کندھی کھل گئی۔ ایک بہت بن معمولی سے چہرے والے پینشن یا فٹ شخص نے پیشانی پر  
چشمہ رکھ کر بل چڑھاتے ہوئے پوچھا،  
” کیا چاہیے؟ ”

” اندو تائی ویلنکر یہیں رہتی ہیں نا؟ ” میں نے فوراً ” اندو ” کوتائی جوڑ کر اپنی نیک نیتی واضح کر دی۔  
” رہتی ہیں آپ؟ ” یہ بھی بوڑھا ندہا کی طرح توڑ توڑ کر بول رہا تھا۔  
” ہم ان کے کلاس کے ساتھی ہیں۔ ”

اتنے میں خود اندو نے جھانا کا۔ ندہا کو دیکھ کر وہ بے حد تعجب میں پڑ گئی تھی اور اسے دیکھ کر میں تعجب ہو گیا تھا۔  
کالج میں کا کوئی طرح نوگز کی سازی پہن کر انبوڑہ ڈالنے والی اندو گھر میں پانچ نوگز کی سازی میں ملوس تھی۔  
اس کی چوٹی گھٹنؤں تک آتی ہوئی تھی۔ بالوں میں پھول نانکے ہوئے تھے۔

” آئیے آئیے..... تاتیا یہ بھی میرے ساتھ آزس میں تھے۔ ”  
” پھر مل گیا کیا؟ ”

” ہاں! ہم دونوں کو بھی مل گیا ” میں نے فوراً کہہ ڈالا۔ ورنہ ” باہر نکل جائیے ” بوڑھا کہہ دیگا۔  
” بیٹھیے..... بیٹھیے نا آپ ”۔ اندو ندہا کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے کہہ رہی تھی۔ اتنی بوکھلا گئی تھی،  
اتنی گھبرا گئی تھی، اور اس وجہ سے کیا کون جانے، لمحہ لمحہ وہ زیادہ ہی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ ندہا البتہ  
اطمینان سے بیٹھا۔

ہارئی ایسٹ کا انگریز پوچھیں! ” ندہا اس شخص کو بھگوان نے کیا کیا دے رکھا تھا! اس بوڑھے شخص کے دیوان  
خانے میں ایک وکنورین کری پر بیٹھنے ندانے اس نھاٹ سے یہ الفاظ ادا کیے کہ مجھے لگا کہ اگر وہ بوڑھا نہ ہوتا  
تو اس کے صرف اتنا کہنے پر اندو گلے لپٹ کر فرط خوشی سے روپڑتی۔

” تھے..... نکیو..... ” سوکھے ہوئے تھرائے ہونوں سے اس نے کہا۔

” آج رات کھانے پر آئیں گے کیا؟ ” ندہا پوچھ رہا تھا۔

” کون میں؟ ” اندو کی آواز اتنی زرم تھی کہ مجھے خواہ مخواہ گا لوں پر پھرا نے جیسا لگا۔

” میں نے ڈنار بخش کر دیا ہے ۔ ”

” ڈنر ! ” تیل نہ ڈالی ہوئی جھوٹے کی ڈنر یا جس طرح آواز کرتی ہیں ایسی سکر کر کرتی آواز میں بوڑھے نے کہا ۔

” لیں سر ! نسلیمیر یٹ پورڈ ائر سسکسیس ۔ ”

” کہاں ارتباخ کیا ہے ڈنر ؟ ”

” مورینور میں ! ”

” ہائیل میں کیا ؟ گھر نہیں ہے کیا آپ کے لیئے ؟ ” خود کے سر پر کا ایرینڈی کا پتائاز وردوں سے تھپ کر بولا۔  
” نہیں ! ”

نندا کا ” نہیں ”، میرا لکھجہ چیر گیا۔ نندا کا گھر نہیں یہ کانج کے بہت ہی تھوڑے لوگوں کو معلوم تھا۔ انہوں کے چہرے کی طرف مجھ سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ رات کو میں اور نندا مورینور میں کھانے کے لیئے گئے تھے۔ نندا دروازے ہی میں میرا انتظار کرتے کھڑا تھا۔ مورینور میں نندا کے اصرار پر کبھی کبھار میرے قدم لگ جاتے تھے۔ مجھے جھجک محسوس ہوتی ایک معمولی سے مراثا روز نامے میں تاروں کے تراجم کرنے کی معاونی ادارت کبھی کبھارہ ہتلر، چرچل وغیرہ پر مدیران کو بالکل سُستی آجائے تو چار سمجھداری کی باتیں بتانے والے اداریے لکھنا، ان کاموں کے عوض مجھے ملنے والے کل تیس روپیوں میں مجھے اسے ” لکھی ” میں مدعو کرنے کی حیثیت نہیں تھی۔ لیکن نندا ” آج آنھ بجے مورینور میں ” ایسا فوجی حکم کی طرح دعوت دیا کرتا اور میں ہپنا نا یزد شخص کی طرح جایا کرتا۔ آج نندا خوبصورت سوت پہنے کھڑا تھا۔ آزو بازو سے آنے جانے والے صاحب لوگوں کے میلے میں وہ انہیں میں سے ایک لگتا۔ انگریزوں نے اس کے آٹھ دس سال بعد یہ دیش چھوڑ دیا، اس سے قبل کہپ میں جاتے ہوئے یوں ہی ڈر سالگ جاتا۔

” آگیا ! .. آ ! ” اس کے مندر سپتک سروں میں اس نے خوش آمدید کہا۔ ” چل ! ”

جسم بچاتے میں نیبل کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ اتنے میں ایک پارسی لڑکی نے نندا کو نیبل پر کہنی نیک کر اپنے گورے گورے چولائی کی پھلی کی طرح نازک انگلیوں سے ” ویش ” کیا۔ نندابھی با تھا انھا کرائے قبول

کیا۔ اسے یہ با آسانی کرنے آتا تھا۔ میں تو اس موریوں میں، صاحبِ ملک میں تھے اس وقت تک، کبھی سیر ہو کر کھانا کھانے کا۔ نندا کا وہ بار کا معمول تھا۔ اس ہائیل کے پتچواری سے شانت بیلوں کا منڈپ تھا۔ وہاں ایک کونے میں ایک مخصوص نیبل ابے ملا کرتا۔ ہم اس جانب جانے لگے۔ اور قریب سے نزدیکی کے ٹھنکنے والے پیالے لیکر جانے والے دیڑ کو دھنکا لگ کر ہونے والا حادثہ آؤ ہے انجھ سے ٹل گیا۔ اس نیبل کے پاس اندوں یلنر بیٹھی تھی۔ رنگ برلنگی اسکرٹ میں گوری خواتین! کالاسوت اور کڑکتی کالر کا سفید شرٹ پہنے ہوئے وہ سُرخ صاحب! ان میں نہ چنے والے ہم دونوں ہی تھے۔ میں اور لیموں رنگ کی سازی پہنی ہوئی اندو! لیکن ان ولایتی پھولوں میں وہ کیتکی جیسی لگی مجھے۔

”یہ گھبرا تا ہے“ نندا نے کہا۔

کس لیئے؟“ اندو نے پوچھا۔

وہ اتنی بے تکلفی سے بول رہی تھی کہ، دوپہر قلعی والے پینڈے سے کی گلی میں پیش آیا واقعہ حقیقت تھا یا خواب یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا! یا یہ خواب؟

”اس ہائیل سے گھبرا تا ہے“۔

”اپنے سے اس صاحبوں کے ہوٹل کا کھانا نہیں کھایا جاتا!“۔

میرے ان الفاظ پر اندو ہنس پڑی۔ دوساروں تک ایک کلاس میں بیٹھے ہم، لیکن اندو کے گال پر گڑھے پڑتے ہیں، وہ پہلی بار میں نے دیکھا۔ کتابوں کا بوجھ اور پلو سنبھال کے کلاس میں داخل ہو کر پروفیسروں کے منہ سے نکلنے والے ایک ایک جملے نوٹ کرنے والی یہی اندو کیا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”کیا لینگکی؟“ نندا نے اندو کے ہاتھ میں مینو تھما دیا۔

”انھیں کیا چاہیئے وہ پوچھ---“ اندو وہ کارڈ میرے ہاتھوں میں دیتے ہوئے بولی۔

میں اس کے ”پوچھ“ اس ایک حرفي تاختاب پر مجروم ہوا اور دیوانہ وار نندا کی جانب دیکھتے ہی رہ گیا اتنے میں اندو نے وہ کارڈ میرے ہاتھ سے لیا اور بالکل اطمینان سے کھانوں کی فہرست کھولی۔

”خوبصورت لگتی ہو آج!“ نندا نے کہہ دیا اور مجھے بلا وجہ چکرانے جیسا محسوس ہونے لگا۔ میرا سینہ دھڑک

رہا تھا۔ دھنا جی کا گھوڑا کہتے ہیں مسلمانوں کو پانی میں نظر آتا۔ مجھے سامنے کے ٹماڑوں پ میں اندوں کا بورڈھا نظر آنے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ نند اکانج کی کس لڑکی کے ساتھ کہاں گیا تھا اس کی تفصیل ہم سارے دوستوں کو معلوم رہتی۔ یوں بھی ہم نے فرست ایرز کی روپیہ المیا؛ یہ نام کی بیج خوبصورت لڑکی کے ساتھ اس کا نام طے کر رکھا تھا۔ کل اگر میں نے اپنے دیگر دوستوں کو نند اور اندوں لینکر یہ نام جوڑ کر بتا دیا ہوتا تو انہوں نے تفتیش کے بغیر مجھے ایروڈینج دیا ہوتا۔ لیکن یہ میرا آنکھوں دیکھا واقعہ تھا۔

پس منظر سے نگیت کے سڑ آر ہے تھے۔ مخالف سمت کے نیبل سے وسکی کی بُو آرہی تھی۔ نیبل کے قریب سے گزرنے والی اسکرٹ میں نوجوان لڑکیوں کی جانب سے جان لیوا لا یتی خوبصورت اور جسم سے ریشمی کپڑے کھیچ لینے کی طرح سرک رہا تھا۔ ہو بہودن کی طرح دکھائی دینے والا ندا میرے باٹیں جانب تھا اور سامنے اندوں لینکر کی جادو سے پری بن کر آگے آ کر بیٹھی تھی۔

یہ منظر کی ماہر مصوّر کی تصویر کی طرح ابھر کر آیا تھا۔ اس رات میں ان کو کمپ میں چھوڑ کر آگے بڑھا اس رات کی چاندنی ان دونوں کے جسم پر برستے وقت خود کی زندگی کا مقصد پورا ہونے کا احساس ہوا ہو گا۔ سندھیا کی کہانی میں کسی یکشنبی نے اسے سنوارا تھا۔ یہاں اندوں کا ہاتھ ظاہرًا ایک یکش کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن یکش کو بدھ عارہ تھی ہے ایسا کہتے ہیں۔ اس رات کے بعد ان دونوں کو بھی کسی کی نظر لگ گئی۔ ایشور جانے! مجھے کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ بی۔ اے، پر تعلیم ختم کر کے نوکری کی تلاش میں میں بسمی آیا اور ایک دفتر سے مسلک ہو گیا۔

”دیکھ کیا رہا ہے؟“ نند اکانج کے اس انداز میں تھا۔ میں ایکدم چونک اٹھا۔ دل کی رفتار کتنی تیز ہوتی ہے۔ لمحہ بھر میں کتنی سیر کر آیا۔ نند امیرے سامنے کھڑا ہے اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ انگلینڈ چلا گیا اور وہیں کا ہو کر رہ گیا، اتنا ہی مجھے علم تھا۔ کھو یا ہوا کھلونا ملنے کے بعد جیسی ایک بچے کی حالت ہوتی ہے ویسی میری ہو گئی تھی۔

”نند“ میں پاگلوں کی طرح چلا یا۔ جان کس طرح آہی ہو جاتی ہے اس کا احساس مجھے اس وقت ہوا۔ چہرے پر چالیس سال بیت جانے کے آثار واضح طور پر دکھائی دے رہے تھے۔ کالی ٹیریں کی پتلون

اور سفید بیش شرت پہنے وہ سامنے کھڑا تھا۔ بیش شرت پر کسی قسم کی ڈیزائن تھے۔ وہ اس کی نیلی آنکھیں بالکل دیکھیں۔ چہرے پر صابن کی نمی نکی کی تازگی تھی۔

”کب آیا ہندوستان میں ؟“

”کب کا ! چل“

کسی جادوگر کے پیچھے چلیں اس طرح کے پیچھے چلا گیا۔ ”وے سائڈ ان“ میں ہم داخل ہوئے۔ گزشتہ کئی سالوں سے اس ہوٹل میں جا کر چائے پینے کا پلان بنارہ تھا۔

”کہہ !“ اب معمول کے انداز میں نہ دانے کہا جیسے ہم روزانہ ملا کرتے تھے۔ مجھ میں بلا وجہ خوشی کا ابال آ رہا تھا اور یہ نیک بخت بالکل شانت تھا۔

”میں کیا کہوں ؟ تو ہی بول۔ کتنے سالوں بعد ملے ہم ! نہ دانجھے لگا کہ تو انگلینڈ میں بس گیا“ ”مجھے“ ”بس گیا“ یہ لفظ کچھ عجیب سالگا۔ یہ لفظ پونہ وغیرہ میں مستقل رہنے والوں کے لئے نہیک ہے۔ لیکن انگلینڈ میں ”بس جانا“

کس لئے مجھے ”سیٹل“ کہنا چاہیئے تھا۔

”چھے ! انگلینڈ میں کیا ہے“ اب تک اس کے وہ تین تین لفظوں کے بول برقرار تھے۔ آواز بھی ویسی ہی، سیدھا ہاتھ سر کے پیچھے پھرانے کا طور بھی وہی۔

”مجھے کیا پتا ! تو ہی کہہ دے۔ اتنے سال کیا کیا انگلینڈ میں ؟ سترہ اٹھاڑہ سال بیت گئے۔ ایک جنگ عظیم ہو گزری۔ آزادی حاصل ہوئی۔“

”کے !“

”بھارت کو !“

اوائی سی۔ ہاں حاصل ہوئی ! ”ٹوٹیز“ یہ دیڑ کے لیے حکم تھا۔

چچ میں کسی ندیدہ کی طرح دیکھ رہا تھا۔

”مونا ہو گیا تو“ نہ دانے کہا۔

”تو البتہ تھا ویسا ہی ہے۔ ایسا لگتا ہے ہم نے کل ہی بی۔ اے پاس کیا ہے۔ کچھ یاد آ رہا ہے تجھے! باقی تجھے کیوں یاد آ ریگا وہ بحث جی پونے۔ لندن میں رہا تھے سال۔ لندن میں ہی تھا کیا رے!“  
”نبیس، کنی جگبؤں پر تھا۔“

”پیر لیں دیکھا ہوگا نا!“ یہ سوال کرنے پر مجھے باولے پن کا دھیان آیا۔

”دیکھ لیا۔“ نندا کے ذہن میں میری علمی نبیس آئی ہوگی۔

”اور کیا دیکھا؟“

”خوب دیکھا۔“

”نصیب والا ہے بابا! میرے اس فقرے پر کسی چھوٹے بچے کے بچکانا باتوں پر نبیس اس طرح بنس پڑا۔

”کیوں رے ہنسا؟ میں دیکھ گزشتہ انہارہ سالوں سے اس بسمی میں ہوں۔ میں اور دفتر! انوار بستر پر آرام کرتے گزارتا ہوں۔ بھاگ دوڑ میں دادر میں اچھی جگہ تھی وہ چھوڑ کر ڈومبیو لی چلا گیا۔ وہاں سے آتا ہوں روزانہ۔“

”کیسی بھاگ دوڑ۔“

”اے جنگ میں بم گرنے کے خطرے سے لوگ بھاگ نہیں کیا؟“

”اوائی سی! پھر ہوا کیا بم کا حملہ؟“

”نبیس رے! تجھے کسی بات کا علم نہیں ایسا لگتا ہے۔ باقی تو نے البتہ خوب بم کے حملے دیکھے ہوں گے نا؟ بچ گیا، بچ بچ۔ ایشور کے دل میں اپنی ملاقات کرانی تھی۔“

”کس کے من میں؟“

”ایشور کے! اور کس کے؟“

”اوائی سی!“

میری یہ سمجھ میں نبیس آ رہا تھا کہ اتنے سالوں بعد ملا ہوا یہ دوست میرا کہا ہوا ریڈ یو کی خبروں کی طرح ادھوری ادھوری کیا سن رہا ہے!۔

”وہ مرنے دے ۔۔ تیرا کیا ہوا وہ بتا !“

”اچھا چل رہا ہے“ اس نے کہا ۔

میرے مکان میں دراصل اس سے پوچھنا تھا شادی وغیرہ کی باتیں ۔ لیکن ہمت نہیں ہو رہی تھی ۔ مجھے اس خالی کرسی پر اچا کنک اندوں پلٹنکر نظر آنے لگی ۔ سچ کہا جائے تو نندہ کی ملاقات ہونے تک اندوں کی یاد اتنے سالوں میں کبھی آئی نہیں تھی ۔ ذومبیولی تامبی کے سفر میں ایسی یادوں کے لیئے کہاں گنجائش ؟

”کہاں رہتا ہے !“ میں نے نندہ سے پوچھا ۔

”تاج میں“

”باپ رے !“ میرے منہ سے فوراً یہ لفظ نکل پڑے ۔ تاج محل ہائیل کے آس پاس گھونمنے کی تک میری حیثیت نہیں تھی ۔

”کیوں رے !“

”ارے، کتنے مہنگے ہو ٹل میں یہ ! دن میں پندرہ سو لروپیے پڑتے ہیں نا !“  
”فی کس پینتالیس روپیے !“

ایک کے لیئے پینتالیس روپیے ۔ یہ عدد سننے کے بعد اس کے ساتھ دوسرا کوئی ہے کیا یہ شبہ زور پکڑ گیا ۔ لیکن پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی ۔

”نندہ، باقی اتنے سالوں میں تو پہچان نہیں بھولا یہ سچ مجھ تعجب کی بات ہے ۔ تیرے لحاظ سے ہم یعنی ۔۔ !“  
”کہاں نوکری کرتا ہے ؟“

پھر میں نے اسے اپنے دفتر کا پتہ بتا دیا ۔ اس نے ٹیلی فون نمبر لکھ لیا اور اس کے بعد اس کے مجھے فون آنے لگے ۔ ٹیلی فون پر بھی مجھے وہ ”شام کو آتا ہوں گیٹ کے پاس کھڑا رہ“

اتنا کہہ کر گاڑی لیکر آتا اور پھر ہم سیر کرنے جاتے ۔ مجھے بارہا لگتا کہ اسے گھر پر مدعو کروں ۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس اپنے ذومبیولی کے گندے گھر میں مدعو کرنے میں شرمندگی محسوس ہو رہی تھی میں نے اسے کبھی بلا یا نہیں لیکن نندہ نے میری پہچان رکھی اس کا مجھے بے حد اطمینان تھا ۔ ہم بار بار ملتے رہے اور ہوتے ہوتے وہ

عکس

ننداجے میں کبھی دیکھنے پایا تھا وہ انتظار آنے لگا۔

وہ پانچ سال کا تھا اس کی ماں نے طلاق لیکر ایک لکھ پتی شخص سے بیاہ کیا تھا۔ اس کے والد بیرون تھے۔ نندا کے قابل سمجھنے کے بعد سے اس نے انہیں کبھی ہوش کے عالم میں نہیں پایا تھا۔ پانچ سال کی عمر میں وہ ایک پبلک اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں گیا اور اس کے بعد سے آج تک گھر کیا ہوتا ہے۔ یہ اس نے دیکھا تک نہیں تھا۔ اس کے والد کی بہت بڑی جائیداد تھی۔ کئی ایک چالیس تھیں، بنگلے تھے، ملوں میں شنیرس تھے۔

ایک بار ہم باندرہ پائٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ نندا کو یہ جگہ بہت پسند تھی۔ میرے کچھ نہ پوچھنے پر بھی نندا کہنے لگا۔ بڑی دیر تک وہ پارسی کے بھرے بھرے بنچے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ چار پانچ سال کا لڑکا اور اس کا باپ سمندر میں پتھر پھینک رہے تھے۔ کتنی دیر تک ننداباپ میٹے کا کھیل دیکھنے میں محور ہا۔ اور یہ کیک وہ بولنے لگا۔ ناٹک میں منہ ہی منہ میں کچھ کہتے ہیں اس طرح۔ ریڈ یو جس طرح سامعین کی فکرنا کرتے بولتا ہے اس طرح۔ وہ بولنا کسی کے لیے نہیں تھا۔

”میں اپنے والد کے ساتھ ایسے ہی پتھر پھینک کرتا تھا۔ وہ اوپر بنگلہ نظر آرہا ہے تو؟ ہل پر؟ وہ ہمارا گھر تھا۔ میں نے اوپر کی جانب دیکھا۔ جھاڑی سے ایک رجوازے کا کوئا نظر آرہا تھا۔ اس پار ماڈنٹ میری کا چرچ نظر آرہا تھا۔

”چلنے اور پرچلتے ہیں۔“

پھر میں خاموشی سے اس کے پیچھے چڑھان چڑھنے لگا۔ اس راستے کے دونوں جانب خوبصورت باغ ہیں عالیشان بنگلے ہیں۔ ممبوی میں اتنے سال رہنے کے باوجود میں وہ حصہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جس حصے میں سیر کرنے کے لیے بھی شاید پیسے درکار ہوں یہ ذرہ باؤس حصے کی معلومات مجھے کیسے رہیں؟ پارسیوں اور خوجا لوگوں کے بھرے بھرے بنچے اور نیچے ہی میں جوانی سے اٹھلاتی کوئی فرماں پہنے لڑکی نظر آتی۔ لڑکے شور و غل کرتے اُتر رہے تھے۔ ہم دونوں چرچ کی جانب اور جارہے تھے۔ نندا آس پاس کچھ پہچان کی نشانیاں تلاش کرتا ہوا یاد کیختے دیکھتے چل رہا تھا۔

”جسے کچھ یاد آ رہا ہے کیا رے بچپن کا؟“

”وہی دیکھ رہا ہوں“۔ ایک گھر کے باب کی تختی، سمجھتے ہوئے وہ بولا۔ ”لیں، اٹ از دیر!“  
”کیا وہ؟“

”جوہلا! ہندو لہ۔ یہاں میں جھولتا رہتا تھا۔ شیرین نام کی لڑکی تھی وہ ہمارے بنگل پر آیا کرتی تھی۔ لیں۔ اب تک وہ لوگ رہتے ہیں یہاں!“

اتنے میں اس جھولے کی طرف ایک چار پانچ سال کی لڑکی دوڑتی ہوئی گئی۔

”تیری شیرین کی لڑکی ہوگی“۔ میں زیادہ دیر تک شعری ماحول میں نہیں رہ سکتا۔  
نہیں!“

”کس پر سے؟“

”میں آخری سال گھر آیا۔ آٹھ سال کا تھا۔ جھٹی میں آیا ہوا تھا۔ شیر میں کون نفاسید ہوا اور وہ انتقال کر گئی“۔  
”اتنایا ڈا آ رہا ہے جسے؟“

”نافاسید“ یہ لفظ اس وقت سے میرے ذہن میں ہے۔ اس کے بعد کئی سالوں تک آدمی کی موت کے وقت  
اُسے نافاسید ہوتا ہے ایسا لگتا تھا! فتنی!“ یہ کہتے ہوئے نہدا جھولے پر کی لڑکی کی طرف نکل گئے دیکھ رہا  
تھا۔ ”پر ہوگی اُسی فیصلی سے“۔

”کس پر سے؟“

”اُس کی آنکھیں اور بال!“

”کیا!“

”فضل بھائی فیصلی کی ٹریٹ ہے“۔  
چلیں کیا اندر؟ تیری پہچان کا کوئی تو ہوگا۔“

”ہے نا۔“

”کون ہے۔“

---

کس

”میری ماں !“

میں چکرا کر نیچے آئیے نہ گر اس کا مجھے تعجب ہے۔ ندا کی ماں نے اس کے باپ سے طلاق لے کر اس بنگل میں دوسرا گھر بسایا تھا۔

”آگے چل۔“

پھر کچھ دیر خاموش رہ کر ہم آگے بڑھے۔ یہ ہمارا گھر ”برآمدے سے ایک اسی شیخی عشا بھونکنے لگا۔“ ہے یو ”گولڈی، گولڈی!“ ایسا پکارتے ہوئے ایک یورپین خاتون نے اس کتنے کو قابو میں کر لیا اور ہماری جانب کچھ شبہ کی نظر سے دیکھا۔

”بہت اچھا ہے کتنا تمہارا !“

ندا کی صاف ستھری انگریزی سن کر یا اس کی چالیس سال عمر میں بھی نہ ڈھلتی خوبصورتی دیکھ کر، کون جانے وہ عورت خوش ہو گئی اور پھر اس نے پانچ منٹ اُسے سہلا یا۔ ندا اتنے میں باغ دیکھنے لگا بنگلہ پرانی طرز کا تھا۔ برآمدے میں چاروں جانب کثرا تھا اور اس کے لوہے کی بیل بونوں پر انگریزی میں ”پی

”اب کس کی ملکیت ہے یہ؟“

”معلوم نہیں۔ والد نے بیج دیا گتا ہے۔“

”تیرے والد کہاں رہتے ہیں رے؟“ مجھے اطف آیا۔ میں سال کی رفاقت میں یہ سوال آج پہلی مرتبہ میں نے اس سے پوچھا تھا۔

”دیکھنا ہے؟“

میرے ہاں کہنے سے پہلے ہی وہ مجھے چرچ کے پاس لے گیا، اس چرچ کے پیچھواؤزے کرچن قبرستان تھا۔ وہاں قبروں کے درمیان سے راستہ نکالتے ہم آگے آگئے۔ ایک قبر پر اس کے والد کا نام تھا! ملکتی دن کا انتظار کرتے وہ بیٹھتے تھے۔ ندا نہ ہب سے کرچن ہے اس کا مجھے علم نہ تھا۔

”تیرا لرچن نہ ہب ہے یہ مجھے معلوم نہ تھا۔“

”میرا! چھپی چھپی، والد کا!“

”پر والدین کامنڈ ہب وہی بچوں کا نہیں کیا؟“

”ماں نے اسلام قبول کیا۔ والد نے مرتب وقت عیسائی مذہب قبول کیا۔ انہوں نے ایک امریکن خاتوں سے شادی کر لی تھی۔“ میرے لیئے یہ ناقابل برداشت ہونے لگا تھا۔ میری ایک ماہوں زاد بہن ہے سب کا سٹ انجوآن سے شادی کر لی تھی اُس وقت ہمارے خاندان میں کیا غصب برپا ہوا تھا! اب بھی جب کبھی وہ آتی ہے تب کوئی بہادر لڑکی یا بیہودہ خاندان کو ڈبو نے والی آتی ہے ایسی نظر وہ دیکھتے ہیں۔ اور یہاں نند اطمینان سے مجھے بخلی کے جھٹکے دے رہا تھا۔

نند اکی ماں نے گھر چھوڑنے کے بعد اس کے والد نے شراب شروع کر دی۔ جانماد ”کورٹ آف وارڈس“ کے پاس تھی اور نند اب بالغ ہونے تک اس کی دیکھی بھال کورٹ کے وہ سخت مزاج افراد کر رہے تھے۔ ”گھر“ نام کے ادارے کا اور اس کا تعلق آٹھویں سال دائی طور پر ختم ہوا!

”ڈیڈی مجھے نیچے کندھے پر اٹھائے یجاتے!“

اس قبر کی طرف دیکھتے ہوئے نند امجھے بتا رہا تھا اور ہم سمندر میں پتھر پھیلتے تھے۔ ”ہی وازاۓ نائس سول“ نند نے یہ جملہ کہتے ہوئے اس قبر پر سے کچھ اس طرح ہاتھ پھرا یا کہ میرے جسم میں رو نگئے کھڑے ہو گئے ایسے پس منظر میں پلا ہوا یہ نند امیرے ساتھ اُس دن قلعی والے پنڈ سے کی گلی میں آیا تھا اور ایڑنڈی کے پتے سے سرخند اکرنے والے اُس ویلنکر بوڑھے نے اس کی کتنی بے عزمی کی تھی۔

روز بروز مجھے نند انا م کا سایہ خوب و منڈلاتا ہے ایسا محسوس ہونے لگا۔ میرا اور اس کا پچھلے جنم کا احساسات کا بندھن تھا، خدا جانے۔ وہ ہفتے میں بالکل سینچر کوفون کر کے مجھے باہر نکالتا۔ میں اس کے تاج محل میں البتہ کبھی نہیں گیا تھا۔ وہ دفتر کے دروازے پر گازی لیکر آتا۔ ساتھ کے کلر کوں کو چھوڑ کر جانے میں مجھے بڑی ہچکپا ہٹ ہوتی۔ کئی بار دفتر میں ”کون وہ تمہارا پارسی دوست“ ایسی پوچھتا چھبھی ہوئی تھی۔ میں نے ”کالج کا پرانا دوست ہے“ اس سے زیادہ ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ شراون کے دن، سینچر، سائی بابا، راشی، خاندانی رسمیں تھیں والے ہمارے اس سرکاری دفتر کے پنے ٹلے ماحول میں، اچار کے شیشی جیسے جگ میں، اگر میں نے نند اکی کہانی سنائی ہوتی تو نند اکے میٹھے ہوئے دفتر کی کرسی پر لوگوں نے ”گومٹر“، چھڑکا ہوتا۔ کبھی کبھار

میں گیٹ تک نہ گیا تو وہ اندر آتا اور ہمارے اس فائیوں سے گھرے یکش سے اسے کب باہر نکال لاؤں ایسا مجھے لگتا۔

اتنے دنوں تک اندویلینکر کا ذکر بڑی چالاکی سے ملا تھا۔ ندا کا بولنے کا انداز، زندگی کی جسم پر رو نگئے کھڑے کر دینے والے تجربات تک ایک ایک کر کے خوبی سے بیان کرنے کا طریقہ مجھے معلوم تھا۔ ایک بار میرے ہاتھ میں ایک مراثی ناول تھا۔

” دیکھوں! کئی سالوں سے میں نے مراثی کتاب ہی نہیں دیکھی ہے۔“ اس کے ابتدائی جماعت کے بچے جیسے ایک ایک حرف جوڑ کر پڑھتے ہیں اس طرح اس نے ناول کا نام پڑھا۔ ”تی۔۔۔ ملا۔۔۔ منہماں (اس نے مجھ سے کہا)۔ او، آئی سی، کیا کہا؟“

” ارے کیا کہے گی! میرا پیار ہے تجھ پر، ایسا کہا۔“

” اچھا ہے کیا ناول؟“

” کچھ حد تک! کچھ نہ کچھ پڑھنے کے لیے چاہئے۔“ میں نے خواہ مخواہ ہی دفع میں بات کی۔ ” پرم کیا کیا! ہسلی! کتنی عورتیں دیکھی ہیں اس نے؟“

وہ شام لیکن میں زندگی میں بھولنے والا نہیں۔ ندا بم کے حملوں میں لندن میں رہتا تھا۔ اندر گراونڈ ریلوے کے بیچوں پر آ کر لوگ زندگی بچانے کے لیے رات پتاتے تھے۔

موت کے منہ سے نکل کر لوگ ایک دوسرے سے لپٹ کر چونٹیوں کی طرح سوتے تھے۔ اس وقت ہر لمحہ آخری لمحہ تھا۔ کوئی بھی کس کی بھی بانہوں میں اس وقت صرف خوف مٹانے کی غرض سے اطمینان کے لیے گھل مل جاتے۔ وہاں کامل اپ بلا خواہ شاست تھا۔ وہاں خوف کے علاوہ دوسری کوئی خواہش نہیں جاگتی تھی۔ دھرم، نیتی، خلوص، اعتقاد ایسے الفاظ غیر مروجہ سکوں کی طرح کاغذ کے پُر زے بن کر گز میں گر گئے تھے ایسے وقت میں ندا جس کا دنیا میں کوئی بھی نہیں ہو، ویسے موت کے منہ میں بچنے قریب المرگ لوگوں کا منظر، تا انک دیکھنے کی طرح دیکھتے گھوم رہا تھا۔

” گھبرا یا نہیں تھا؟“

"لگھانے سے پرے ایک عجیب ساجذ بہوتا ہے۔ گھبراہٹ کے لیئے بھی ایک "ہم زندہ ہیں تو زندہ رہنے والے ہیں" ایسے سہارے کی ضرورت پڑتی ہے۔ پل پر پاؤں کے نیچے لکڑے کا تختہ ہے تا اس طرح۔ سمجھ تختہ میں نے ہٹالیا اور تو تار کی میں ہی چلنے لگا تو کیا ہو گا؟ لاشوں کے انبار میں پہلی لاش کھل کر آگے بڑھنے تک خوف رہتا ہے پھر کچھ احساس نہیں ہوتا۔ ارے بازو میں کس کی ران پڑی ہے، ہاتھ گرا ہوا ہے، راستے کے دونوں جانب کے مکان ڈھیر ہو گئے ہیں۔ جوادھورے کھڑے ہیں ان میں ایک آدھ پلنگ لٹکتا دکھائی دے رہا ہے، برف گر کر کچھز بُن گئی ہے۔۔۔۔۔ ایسے ماخول میں بھی ایکبار لندن یونیورسٹی کا بوڑھا پروفیسر، میں اور بم گرنے سے تہس نہیں ہوئے سامنے کے مکان کی ایک جوان لڑکی مل کر ہماری بحث چل رہی تھی۔

"کیسی بحث!"۔

"بننا مت! دنیا میں پریم نام کی شے ہے یا محض اس کی تصویر ہے"۔ پروفیسر کہہ رہے تھے، نہیں پریم ہے، وہ لڑکی کہہ رہی تھی، دنیا میں صرف پریم ہی ہے۔ اس کا ایک جوان فوجی سے پیار تھا اور وہ ہندوستان میں تھا اس لیئے بہت خوش تھی۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہاں جنگ نہیں ہے۔ اسے شیر کھا جائے گا اس سے وہ ذرتی تھی! مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ تم لوگوں کے پاس جادو ہوتی ہے نا۔۔۔۔۔ شیر آنے پر اسے واپس لوٹانے کی؟ پھر میں نے اسے منتر بتایا اور کہا، یہ لکھ کر بھیج دے اپنے پریمی کو!

"کیا منتر؟"

"اوہ اسنو پڑ! رگھو پتی را گھورا جرام، اسے میں نے یہ لکھ کر دے دیا اور کہہ دیا کہ ممبی میں کہیں بھی شیر نظر آجائے تو یہ الفاظ بلند آواز سے پڑھنا ہیں"۔

"ممبی میں؟"

"وہ ممبی میں تھا کہتے ہیں"۔

"بیچاری؟"

"اس لڑکی نے اپنے پاس کے آخری دوچاکیست مجھے دے دیئے"۔

”ٹو نے لئے؟“

”نبیس میں نے اس سے کہا کہ ہندو دھرم میں جادو بتانے والے کو اس قسم کے تخفے لینے کی اجازت نہیں ہے۔“

”اور تیرا وہ مزاق بھم حملوں میں بھی جاری تھا؟“

”پھر کیا کیا جاتا؟ ابتداء میں لوگ روپڑے، چیخ آئئے۔ پھر پندرہ دنوں کے اندر شست پڑ گئے۔“  
”نہ دا ایک منگر!“

”شادی کیوں نہیں کی؟ رائٹ!“

”ہاں!“

”کی تھی میں نے شادی“

”کس سے؟“

”اب! تجھے کیا بتاؤں؟ ایک لڑکی سے۔“

”ایسا کیا؟ مجھے لگا انگلینڈ میں صرف لڑکوں ہی کے بیاہ ہوتے ہیں!“

”پھر لڑکوں سے بیاہ نہیں ہوتا تو کس سے؟“

”ارے، لیکن اس کا کوئی نام، گاؤں!“

”اس کا نام تھا۔ ولما، اور گانو نہیں تھا۔ صرف دلیش تھا، جرمنی!“

”جرمن لڑکی؟ پر تجھے جرمن زبان آتی ہے؟“

”اس میں کیا مشکل ہے! لیکن اُسے انگریزی آتی تھی نا!“

”پھر تھیک ہے۔“

”ہاں! تھیک ہے۔ اور کوئی سوال؟“

”خفا ہو گیا کیا بابا؟“

”نبیس کر لے۔۔۔ تیرا اگلا سوال کیوں؟۔۔۔ فی الحال وہ کہاں ہے؟“

”چیزی تجھے تکلیف ہو رہی ہوتا ہے۔ ہم کچھ اور بات کریں گے۔“

”ارے تکلیف کیسی! میں برلن میں رہتا تھا۔ ایک جرمن رنگ کے فرم میں کام کرتا تھا۔ وہاں وہ تھی۔“

”وہاں تمھیں پیار ہو گیا۔“

”کون جانے! لیکن ہم نے شادی کی۔ وہ جیو (یہودی) تھی۔ پھر جنگ شروع ہو گئی۔ اس کے آگے کا حال جانتا چاہتے ہو۔“

”نہیں چاہیے!“

”یکش کو بدعاہتی ہے یہ میں نے پڑھا تھا۔ البتہ اس یکش کو لتنی بدعاہمی تھیں!“

”پھر اس کے بعد تو نے شادی نہیں کی؟“

”ارے شادی کروانے کے لیے۔ بحث جی، پادری، قاضی۔۔۔ کوئی تو جگہ پر موجود چاہیئے نا! کوئی بھی نہ تھا۔ پھر خوب شادیاں رچائیں میں بنے۔ خوب پیار کیا۔ اس میں کیا؟ وہی جملے۔۔۔ انگلش، فرانچ، جرمن زبان میں ادا کرنے ہیں اور سننے ہیں۔۔۔ تیرے اس ناول میں نہیں ہے کیا یہ؟“

مجھے اس مراثی ناول پر ترس آیا۔ خود کی بیوی کے ساتھ ”ایک کم ایک، ایک دوئی دو“ کرتا ہوا ہندو کالونی کی گلیوں کی طرف اپنی کھڑکی سے دیکھتے زندہ رہنے والا وہ پاؤں سے خائف ناول نگار صفت نازک کے بارے میں لکھ رہا تھا۔ اور یہاں بم جملے میں آندھی میں اڑنے والے پتوں کی طرح اڑ کر آئی ہوئی انگنت عورتوں کو تصورات کی آنکھ سے دیکھا ہوا انسان تیرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی ماں پانچ سال کی عمر میں اُسے چھوڑ کر دو گھر پار کر کے اپنا سنوار چلا رہی تھی۔ بیر شرباپ قبر میں شراب اور عورت کی سہولت کیوں نہیں اس بارے میں یوم نجات کو اللہ کے سامنے اعمال کا حساب دیتے ہوئے کس سوال سے شروعات لی جائے اُس کی فکر میں بیٹھا تھا۔ نہ دانے بلا بل کے گھونٹ سے ہی زندگی کا پہلا مزہ چکھا تھا۔ کس لیے تو سدا احتیاط سے رہنے والا میں اور ”احتیاط کرنے جیسا دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے کیا؟“ ایسا سوال کرنے والا نہدا! بھگوان کی دنیا کی یہ ایک عجیب جوڑی بنی ہوئی تھی۔ فطرت بھی کیا حد مقرر کرتی ہے! واہ! نہ دانے زندہ رہنے کے لیے کیا مشغله اختیار کیا اس کا مجھے علم نہ تھا۔ اچھی خاصی بڑی موڑ گاڑی تھی۔ تاج میں رہتا تھا۔ ممکن ہے

والد کی بڑی جائیداد ثابت رہی ہو۔

ہم البتہ اب بڑے کھلے دل سے باتیں کرتے تھے۔ لیکن وہ میرے ساتھ اتنا وقت کیوں بتاتا ہے وہ میرے لیئے معتمد تھا۔ ایک بار وہ مجھے اپنے تاج محل کے کمرے میں لے گیا۔ وہ ماحول دیکھ کر میں لگ بھگ تعجب میں پڑ گیا تھا۔ نندالیکن اس عیش و آرام میں اطمینان گزار کرتا تھا۔

”آج ہمیں ساتھ کھانا کھانا ہے۔“

”لیکن تیرے اس ہوٹل میں کھانے کا لباس پہنانا پرتاب ہے۔“

”ڈونٹ وری!“ تو نے ہی کہا تھا ان کے بھارت آزاد ہو گیا ہے! تیرا یہ لباس چل جائے گا۔ ارے دھوتی کہیں بھی چلتی ہے!“

اور اس روز پہلی مرتبہ اندوڈلنکر یہ موضوع چھڑ گیا۔ میں سال قبل اسی تاریخ کو ہم موریونور میں کھانے کے لیئے گئے تھے۔ میرے ذہن میں تاریخ نہیں تھی، نندال کے تھی۔

یہ یوگی شخص اپنی زمین سے اتنا جڑا ہوا ہو گا اس کا مجھے انداز نہیں تھا۔

میں نے انھیں کہپ میں چھوڑ دینے کے بعد کی پوری کہانی اس نے مجھے کہہ سنائی، جنگ کی بھڑکی ہوئی آگ میں اس کے وجود کا کئی بار خاتمہ ہوا تھا۔ صرف ایک چیز برقرار تھی۔ وہ اس نے اپنے پاکٹ سے نکال کر میرے سامنے رکھ دی تھی۔ ایک بہت ہی پرانا خط تھا۔ اندوکا اسے آیا ہوا خط! اندونے اس میں اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ میں نے صرف کتابوں ہی میں پیار کے خطوط پڑھے تھے۔ یہ بچ مج کا پیار تھا۔ میں سال پہلے کی اس پر تاریخ نہیں تھی۔ وہ خط پڑھتے پڑھتے میری آنکھوں سے آنسوؤں کی قطار لگ گئی۔

”اے پگلے روتا کیا ہے!“

نندال مجھے ہمت دی لارہا تھا۔

یکا یک نندال مجھے باندرہ کی کھاڑی میں پتھر پھینکنے والے بچے جتنا چھوٹا لگنے لگا۔ میرے چھوٹے بچوں کو میں پیار سے سہلا تا ہوں، پیٹھے تھپٹھا تا ہوں اُسے چومتا ہوں، اُس طرح اُسے کروں ایسا لگنے لگا۔ لیکن کچھ بھی کر کے میں ایک کمزور کلرک تھا۔ صرف میری آنکھوں نے یہ بندھن نہیں نجھائے۔ آخر وہ خط اُس کے ہاتھ

میں دیکھ میں نے کہا۔ ”ندا، دنیا میں بھروسہ نہیں ہے رے!“

”ارے دنیا میں کچھ بھی نہیں ہے رے! جس وقت ہم سانس لیتے رہتے ہیں تو، اتنا الحد ہوتا ہے۔ وہ دیکھ، کھڑکی کے باہر سمندر دکھاتے ہوئے ہے بولا۔“ وہ سمندر ہے نا؟ اس میں ہمیں کیا دکھائی دے رہا ہے؟ لہریں نظر آرہی ہیں، وہ جہاز نظر آرہے ہیں۔ وہ پچھیرے، دیکھ جھوٹی کشی لئے نکل پڑے ہیں انھیں کیا دکھائی دیتا ہے؟ صرف مجھلیاں نظر آتی ہیں۔ وہ اور مجھلیاں۔۔۔ ان کے درمیان آنے والی رکاوٹ یعنی سمندر! جیون جسے کہا جاتا ہے نا وہ ہماری پیدائش سے ہماری موت تک وہ صرف اسی طرح آزے آتے رہتا ہے۔ باقی کچھ بھی نہیں رہتا، کبھی وہ بڑی لہریں بن کر آتا ہے۔ آندھی بن کر آتا ہے۔ کبھی یونہی ہٹ دھرم سے راستہ روکے پڑا رہتا ہے۔ پھر اکتا ہٹ پیدا نہ ہواں لیے ہمیں لیبل چپاں کرتے ہیں۔ پریم کہتے ہیں، بیوی کہتے ہیں، ماں کہتے ہیں، دھرم کہتے ہیں، دیو کہتے ہیں جو دل میں آئے وہ کہتے ہیں۔ ورنہ زندگی یہ بے وجہ دھوکا دہنے والی شے ہے۔ اس سمندر کی طرح!“

”ایسا کیوں کہتا ہے تو؟ اندوکی تجھے یاد آتی بھی ہے یا نہیں؟“۔۔۔

”ارے، تو نے جس وقت کوئی کا بڑا جال سمندر سے کھینچ کر نکالتے ہیں اس وقت دیکھا؟ اس جال میں پھنسی ہوئی مجھلیاں اُتنے سے وقت میں جھوٹی مجھلیوں کو نکڑے کر کے نکل جاتی ہیں۔ پنور سلوس!“

”اندو نے تجھے کیوں انکار میں جواب دیا؟“

”ولما کوہٹلر کے فوجی میرے سامنے کیوں کھینچ کر لے گئے؟ چوبے سے بھی گھبرا نے والی ولما کیا ہٹلر کو کھانے والی تھی؟ تجھے دیکھ لینا چاہیئے تھا اے۔۔۔“

”فونو ہے اس کا!“

”ارے، کس کی تصویر میں رکھوں؟ اور کس لیے؟“

”پھر اندو کا خط کیوں رکھا؟“

”تجھے تجھ بتاؤں۔۔۔ نہہر!“

لحد بھرندا خاموش بیٹھا۔ گناہ شروع کرنے سے پہلے گویا جس طرح ظبورے کے سڑوں میں گم ہوا بیٹھتا ہے

اُس طرح وہ بیخا تھا تجھے یاد آتا ہے، اپنے انگلش کلاس کے طلبہ کی بڑپ کار لائیز گئی تھی۔“

”اچھی طرح یاد ہے! شبد کی مکھیوں کے چھٹے کوتونے پر ٹھر مارا تھا اور مکھیاں اڑتی تھیں سبھوں کو کارت لیا انہوں نے۔ منہ یہ یہ ہو گئے تھے سونج کر! صرف میں بچ گیا تھا، کیونکہ میں راستے پر ہی بیخا ہوا تھا۔“

”ایک غلطی ہوئی! انہوں نیں کافی تھیں۔ مجھے تو بڑی طرح زخمی کر دیا تھا! اسٹینشن پر انہوں نے مجھ سے کہا ”اب آپ کہاں جائیں گے؟“ میں نے کہا۔ ”ہمارے کرنے پر، لیکن آپ کو دیکھے گا کون؟“ میں نے از راہ مذاق کہا۔ ”تم دیکھو“ اور تجھے معلوم ہے۔ وہ پلکی لڑکی۔ گھر گئی اور رات کو میرے کرنے پر آئی۔ رات بھر میرا سر اپنے زانو پر رکھ کر بیٹھی اور دیوانہ وار روئی رہی۔ کیوں کہ کسی نے اسے بتا دیا تھا کہ میری ماں مجھے چھوڑ کر بھاگ گئی وغیرہ۔ زندگی میں صرف ایک دن کا بچپن مجھے نصیب ہوا۔ آیا اور نیانی کی ذائقہ پت کے بچ میرا بچپن گزر۔ کبھی کبھار ڈیڈی ہوش میں رہیں تو سمندر پر مجھے لے جاتے، بس !“

”لیکن کالج میں اس کا کے بھی علم نہ ہوا کا۔“

”صحیح میں اس کے گھر چھوڑ آیا تھا۔“

”اور اس کا بوڑھا؟“

”اے اس نے کیا کہا تھا وہی جانے! رات بھر آنکھ سے آنکھ نہ مل کر بیٹھی رہی۔ پلکی! میرے منہ پر بٹا گیا۔ پلو سے ہوادے رہی تھی۔ تجھے کیا بتاؤں چمچے سے چائے پلانی اس نے مجھے۔ اس رات کتنے برسوں، بعد میں پہلی بار رویا تھا۔ اور اس روئے میں کبھی کسے نہ کہا ہوا میرا حال اس کو کہہ سنا یا۔ نومبر کا مہینہ تھا۔ سخنہ میں کڑکڑاتی وہ سمجھ میرے ساتھ چل رہی تھی۔ میں نے اپنا کوت اسے پہنچ پر مجبور کیا تھا۔ وہ راضی نہیں ہو رہی تھی۔ پھر، او مانی گاو۔ چاہیلہش !“

”کیا رے؟“

”میں نے اسے قسم دی !“

”کس کی؟“

”میری! اور اس باوٹی نے کہا، توڑ دی کہہ، توڑ دی کہہ۔ ایسا کچھ کہتے ہیں یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ میں نے کہا،

پہلے کوٹ پہن لے، وہ کہہ رہی تھی پہلے ٹوٹ گئی کہہ۔۔۔ پھر میں نے ٹوٹ گئی کہدیا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ ٹوٹ گئی نہیں کہنے سے کیا ہوتا ہے؟۔۔۔ انسان مر جاتا ہے؟ اُس نے فوراً میرے منہ پر ہاتھ رکھا اور کہا مجھ سے پہلے تھے میں مرنے نہیں دوں گی۔ میں نے کہا، کیوں رہی؟ ویسی وہ پلگی بول انھی۔ ماں کا دُکھ کتنا عظیم ہو گا اس کا احساس کل رات مجھے ہوا۔ ایسے عجیب و غریب تصورات تھے اس کے۔ ہم رجڑڈ میرتھ کرنے والے تھے! تو ہمارا گواہ اور اس کی ایک سیلی دوسرا گواہ بننے والی تھی۔ اور شادی ہونے کے بعد پہلے وہ مجھے۔۔۔ بنے گا، مجھے۔۔۔ مجھے بھی بنسی آرہی ہے۔۔۔ کیسے دیوانے لڑکے تھے رے ہم لوگ۔۔۔ وہ مجھے نہلانے والی تھی۔ ٹیکا سر پر لگانے والی تھی۔۔۔ اور جھاری سے دودھ پلانے والی تھی۔۔۔ ایسا پاگلوں سا کورٹنگ کیا ہو گا کیا رے کسی نے؟۔۔۔ یہ پلگی۔۔۔ وہ خط ہاتھ میں پکڑتے ہوئے نندانے کہا۔ ”لیکن یہاں بھی ایک ہتلر آیا۔ کوئی وجہ نہ تھی۔ اندو اُس رات اس سے کہنے والی تھی۔ لیکن وہ بوڑھا ہاتھ میں لکڑی لئے جا گتے بیٹھا تھا۔

میں نے اُسے دروازے پر چھوڑا اور مجھے چینخ سنائی دی۔ میں ویسے ہی اس کے گھر میں گھس گیا۔ باہر ریٹائرڈ ایجوکشنل انپکٹر کا بورڈ لگانے والے شخص نے مارنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے ہاتھ کی لکڑی چھین کر میں نے اس کے منہ پر جمادی۔ بوڑھا تملکا کر نیچے گر پڑا۔ اندر سے ایک خاتون دوڑتی ہوئی آئی۔ اندو سے کچھ بڑی ہو گی وہ اس بوڑھے کی تیسری بیوی! آس پاس کے لوگ جمع ہو گئے۔ اور میں نے اندو سے کہا ”چل! ایسی ہی چل میرے ساتھ“، بوڑھا غافٹے سے اندر گیا سوئے ہوئے دوپچے کھینچ لایا، دروازے میں پھینک دیا۔ پالنے کا ایک بچہ لا کر اس کے پاؤں کے پاس پنک دیا اور اور چیختے ہوئے بولا۔ ”جا..... تیری تعلیم کی خاطر اتنے پیسے خرچ کئے بوڑھا پے میں۔ ان بھائیوں کے پیٹ میں دونوں اے ڈا لیکی ایسا لگا تھا۔ رومنڈاں اُنھیں اور جانکل دروازے سے باہر!

”ایسا کہہ کرو وہ بوڑھا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اندو ” نندا ” کہہ کر چلائی اور زینے سے دوڑتی ہوئی اویر گئی۔ گئی وہ گئی۔ اس کے بعد اس کا ایک خط آیا تھا..... وہ کھو گیا کہیں تو۔“

” لیکن یہاں اونٹے پر تو ملائیں اُس سے ! “

” میں نہیں ”

” ملنے کی خواہش ہوتی ہے کیا تیری ؟ ”

” بہت کر کے نہیں ! ”

” بہت کر کے نہیں یعنی ؟ ”

” یعنی .... سچ کہوں کیا تھے، مجھے کچھ بھی نہیں لگتا۔ ”

” پھر تو مجھ سے کیسے ملتا ہے ؟ ”

” کچھ سمجھ میں نہیں آتا میرے۔ شاید فوجی ملوں ”

” ایسا مت کر بابا ! تو نہ ملے تو میں تیرے دروازے پر آکر کھڑا رہوں گا ! ”

پھر ہم نیچے بڑے ہال میں کھانا کھانے کے لئے گئے۔ ایک ٹیبل کے پاس تین لوگوں کے کھانے کے لئے کانٹے چچے رکھے ہوئے تھے۔ میں ایکدم گھبرا لیا پہنچا یا۔ اتنے میں کسی سفستھان کی رانی کی طرح نظر آنے والی ایک عورت سفید لباس میں آئی۔ پچاس سے اوپر کی عمر ہو گی اسکی۔ اس نے نندا کی پیشانی چومی۔ میں نے دھیان نہیں ہے جتنا کے لیئے دوسری طرف دیکھنا شروع کیا۔ اتنے میں اس عورت کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے نظر آنکھوں پر پڑی اور میرے ذہن میں کچھ یاد آ رہا ہے ایسا احساس ہو رہا تھا اور نندا کے لفظ میرے کا نوں میں پڑے۔

” میری ماں ! ”

تمیری خالی کرسی پر وہ بیٹھی۔

اب بھی سپر کی دو پہر یعنی فون کی گھنٹی بجتی ہے اور نندا اپنے وہ خاص انداز میں کہتا ہے۔

” پھائک کے پاس کھڑا رہ ”۔

میں اس کا انتظار کرتے پھائک کے پاس کھڑا رہتا ہوں۔ ☆ ☆ ☆

(ویکٹی آنی ولی)

## انتوبروا

رتناگری کی اس درمیانی گلی میں معروف اونگ رہتے ہیں۔ دیوتا نے ان لوگوں کو نزالے ڈھنک سے گڑھا ہے۔ ان میں رتناگری کے لال ٹھروں کے، ناریل، کھل کے، کھلبی والے الو (تیرہ) اور پھٹ کہتے ہی جان گلے میں لانے والی گیلی سپاری کے سارے مگن جمع ہو گئے ہیں۔ رتناگری کے انجام میں ہی یہ بھوت پریت پوشیدہ ہے یا پانی میں زندگی عطا کرنے والی ہوا کے ساتھ اور کوئی ہوا ملا دی ہے۔ وہ اس رتناگری و شویشور کو ہی معلوم ہے۔

انتوبروا اسی مئی میں اونگ آیا اور پک گیا۔ دراصل انتوبروا کو کوئی صرف انتو کہہ کر پکارے ایس کی عمر نہ تھی۔ میں نے بارہ چودہ سال پہلے انھیں دیکھا اس وقت ہی اس کی داڑھی کے کھونٹ اور کان اور چھاتی پر کے بال پکے ہوئے تھے۔ دانتوں کا بیشتر حصہ اونگو گئے بن گیا تھا۔ اونگو گئے ہوتا یعنی گرجانا یہ انتو نے مراثی زبان کو عطا کئے ہوئے فقرے کا روپ ہے۔ رتناگری کا اونگو گئے وکیل کئی سالوں سے مسلسل ایکشن میں گرتا (بارتا) آیا ہے۔ اس وقت سے کنوئی میں درختوں سے بھور بھی گرجائے تو بھور کا "اونگ" ہو گیا کیا ایسا انتو چلاتا ہے۔

رو برو انتو کو کوئی انتو کہہ کر نہیں پکارتا لیکن اس کا ذکر صیغہ واحد میں ہوا کرتا۔ ممکن ہے، کوئن کے اونگ صیغہ واحد میں گفتگو کرنے والے۔ لیکن انتو سے تھا طب "انتو شیٹھ" سے ہوتا ہے۔ اس چت پاؤں سے ولیش پیشے کی سند پہلے زمانے سے چکی ہوئی ہے۔ انتو کے ہاتھ سے وہ گناہ سرزد ہوا تھا۔ پہلی جنگ عظیم

کے وقت بندرگاہ پر کسی چیز کی دکان ڈالی تھی۔ وہ کب کی ذوب چکی۔ لیکن ان تو کے سینہ بننے کے لئے اتنی بجہ کافی تھی۔ اُس کے بعد ان تو نے روزی کے لئے کیمے ہوئے کام کانج کی یاد کے بھی نہیں۔ دو وقت کے کھانے کی اس کے لئے کہیں تو سہولت ہے۔ تھوڑی زمین ہے، ناریل کے پانچ پچاس، سپاری کے دس پندرہ اور کوم کے کچھ درخت ہیں۔ دو پانچ درخت آپس آم کے ہیں۔ کہیں کھل تو کہیں املی کا شجر کھڑا ہے۔ آباء اجداد کی وراثت سے گھر کے حصے میں ایک کمرہ و پڑوی (پچھلا کمرہ) آئے ہیں۔ کنویں پر استعمال کا حق حاصل ہے۔ ان سارے سہاروں کے بل پر ان تو سینہ کھڑے ہیں۔

اسکی اور میری پہلی ملاقات باپو ہیکشٹے کی دکان پر ہوئی۔ میں سگریٹ خریدنے گیا ہوا تھا اور ”کیسری“ اخبار کے عقب سے نیم حصتی ڈنڈیوں والی عینک اپنی پیشانی پر لیتے ہوئے ان تو سینہ نے سوال کیا تھا۔

”وکیل صاحب کے داما دتا؟“

”ہاں!“

”فوراً میں نے پہچان لیا! بیٹھے! باپو داما دصاحب کے لئے چائے منگوائے۔“ اچانک اتنی گہری پہچان و تعلقات والا یہ معمر شخص کون ہے میری سمجھ میں نہیں آیا پر ان تو سینہ نے ہی خلاصہ کر دالا۔ ”تمہارے سرہارے دوست ہیں۔ کہیئے انھیں ان تو بروایو چھر ہاتھا۔“

”ٹھیک ہے!“

”کب پونے سے تشریف لے آئے؟“

”پرسوں ہی آیا ہوں۔“

”برا بر۔ دیوالی کا تہوار ہو گا۔ مانگنے اچھی فورٹ گاڑی! کیا؟“

”آپ کے دوست ہے نا آپ ہی کہئے۔“

”واہ آخر پونے والے آپ، بولنے میں مانے والے ہیں کیا ہمیں! پھر آپ کا قیام ہے یا فلاںگ وزٹ؟“

”دو تین دن بعد جاؤ نگا۔!“

”بہتر!“ تھوڑے ہی میں لطف رہتا ہے۔ اس سڑے والے کسوپ روکیل کے داما دکی طرح مت کرتا۔ اس

نے چھ ماہ کے لئے خیمه گاڑ دیا۔ بالآخر کسوپر وکیل نے ایک دن صحن میں گوبر لینے لگا دیا۔ ! داماڈ زیادہ دن رہ جائے تو وہ تکلیف ذہ ستارہ بن جاتا ہے۔ کیسے ؟ ”  
” درست ہے ! ”

” بالپوشیدھ، پہچانتا یا نہیں ؟ ہمارے وکیل کے داماڈ ! ہم دونوں بھی ان کے ہی مُوکل ہاں ! ”  
بینکشے نے نہ سکا رکیا۔

” چاۓ لیں گے کیا ؟ ”

” نہیں جی، خوب گرم ہو رہا ہے۔ ” میں نے کہا۔

” جناب رتنا گیری میں گرمی رہیگی ہی۔ مویشیوں کے باڑے میں سونے والے کو یہ کہکر کہ نیل کے نوت کی بد بو آرہی ہے چلے گا کیا ؟ ” آخر میں ” کیا ” اوپر کی لئے میں اٹھاتے ہوئے انتو شیڈھ بولے رتنا گیری میں مخندی ہوا ہوتی تو شملہ نہ کہتے ہمارے گاؤں کو ! لیکن تمش کی تمہارے سڑے پر بہت تکلیف ! وہ پھر کے وقت سائکل پر پاؤں ماریئے اور سیدھے پہنچ جائے ہمارے ساری کے باعثے میں سونے کے لیئے۔ ساری کا بااغ یعنی اڑکنڈیشناں ہاں ! ” کھل کر ہنتے ہوئے انتو شیڈھ بولے۔ اوپر سے ” ہمارا یہ کنسری مذاق داماڈ صاحب ” یہ بھی کہہ دیا۔ ” بالپوشیدھ، مہماں قلم کار ہیں صاحب ہمارے آباشیٹ کی طرح ناٹک لکھے ہیں۔ زیادہ بولیے مت ورنہ لکھ دیں گے تم پر نمونے کا بھروپ ! ”

انتو بردا تک میری کردار کی رسائی سے حاصل شدہ خوشی بالپوشیدھ بینکشے کے سوال سے ناپید ہو گئی۔ مجھے اچھی طرح عزت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے ” کیا کرتے ہیں ؟ ”

” کیا کرتے ہیں یعنی ؟ آپ بے وقوف تو نہیں بینکشے ؟ وہ رذی نکال۔ دس جگہ تصویر کے نیچے نام شائع ہوا ملے گا تمھیں۔ سینما میں رہتے ہیں۔ ”

” کیا کہہ رہے ہیں آپ ؟ ” بینکشے میری جانب ” میں نے براہما پالیا ” کہیں ایسا چہرہ بنا کر دیکھتے ہوئے کہا ” داماڈ صاحب ایک بات پوچھوں کیا ؟ ” عیاری بھرے سوال کا شوق چھرے سے عیاں تھا۔  
” پوچھئے تو ”

” ایک سینما نکالنے پر کیا ملتا ہے تمہیں ؟ ”

میں کوئی پہلی بار کون میں نہیں آیا تھا ، اس لئے یہ سوال میرے معمول میں سے تھا۔

” وہ سینما سینما پر منحصر ہے۔ ”

” نہیں ہم نے پڑھا ہے ایک لاکھ ڈیڑھ لاکھ ملتے ہیں ..... ”

” مراثی سینما میں اتنے کہاں کے ؟ ”

” سمجھ لجھئے ! پانچ صفر میں سے تین تو وہ گرتے ہی ہونگے ..... ”

” گرتے ہیں کبھی کبھار ڈوب بھی جاتے ہیں ! ”

” ابھی، وہ تو چلتا ہی رہیگا۔ دھندا کہیں تو چڑھنا اور توڑو بنا آہی گیا۔ اور ایک بات پوچھوں کیا؟ ..... یعنی خفانہ ہونگے تو ..... ”

” نہیں غصہ کس لئے کیا جائے ؟ ”

” سینما کے اداکاروں کے بارے میں ہم یہ جو کچھ پڑھتے ہیں وہ حق ہوتا ہے یا محض گنگا دھرواداشٹ کے اصل بیلگاؤی ملکتن کی طرح آتا ملا یا ہوا ؟ ”

” یہ جو کچھ یعنی ؟ ” میں نے خواہ مخواہ تجاذب عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا۔

” مان گئے اسٹاد ہیں داما صاحب ! کورٹ میں گواہ کے طور پر خوب نام کمائیں گے ! ابھی صاحب، یہ جو کچھ یعنی سید ہمی انگلی کو ناک تک لے جانے والا معاملہ ہے یہ ..... ”

یہ سید ہمی انگلی کو ناک لی جانے والی بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ آخر انتو شیٹھ نے اپنی سید ہمی انگلی نہنؤں سے لگاتے ہوئے عملی طور پر خلاصہ کر دیا۔ اسی اثناء ہیکشٹھ کی منگوائی ہوئی چائے آگئی۔

” لیجئے ”! انتو شیٹھ نے میرے ہاتھ میں کپ دیا اور اس چائے والے بچے کو ” رتنا گری کی ساری بھینیں اچاک حاملہ ہو گئیں کیا جھمپیا ؟ ” ایسا جاتے جاتے چائے کے رنگ پر ریمارک مار دیا اور رکابی میں چائے انڈیل کر پھر پھر پھونکنا شروع کر دیا۔ حق کہا جائے تو اس بچے سے چائے میں دودھ کم ہے یہ وہ کہہ سکتے تھے لیکن انتو شیٹھ کا ہی نہیں پوری گلی کا بولنا شیز ہا۔

انتو کی اور میری پہچان اب پُرانی ہو گئی ہے۔ پچھلے دس بارہ سالوں میں جتنی بار میں رتنا گیری گیا اتنی بار میں ان سے ملاقات کر آیا۔ ان کے حلقہ احباب میں انہوں نے مجھے ڈھال بھی لیا۔ ایک دوبار گنجیفہ (تاش) سکھانے کی کوشش بھی کی اور اس سانحہ سال کے قریب و جوار میں کھڑے بزرگوں کے حلقے میں پھر انتو شیٹھ اور ان کے ساتھی کا زندگی سے متعلق نرالا فلسفہ و منطق سنتے آیا ہوں۔ ان کا خاص اسلوب زبان وہاں میری سمجھ میں آیا۔ کندھے پر پیر ہن، کمر میں دھوتی، پاؤں میں نئی چپل، ایک باتھ میں ڈنڈا اور دوسرے باتھ میں قندیل لئے، ”اے گوند بحث، ڈالے گا کیا دوداؤ؟“ یا ”پرانے بگ رہا ہے یا سو گیا ہے تیرا جگر؟“ ایسی آواز س نکالتے تاش کے کھلاڑی ساتھی جنم کرنے والے اس گروہ میں میں بھی بھٹک گیا۔ تاش کا دادا کچھ خاص نہ جم پائے تو پتے پھینک کر

”داماد صاحب کبئے ایک آدھ مالکوس گذبو لے پیٹ تھوڑا طبلہ مہمان کے ساتھ۔ کھاتو شیٹھ، کے لیے تمہارا ذتبہ۔“ ایسی فرمائش کے بعد میں اپنی آواز بھی صاف کر لیتا۔ ”زڈے (گلے) میں مزہ بے باں بخرا رے!“ یہ داد وہاں مل جاتی۔ سال دو سال بعد ایک آدھ سفر رتنا گری کا ہو جاتا۔ ہر پھرے میں البتہ ایس آدھ ممبر کے چل بننے کی خبر ملتی۔

”رامو کا کہبیں نظر نہیں آئے انتو شیٹھ!“

”کون؟ دامونینا؟ وہ مرے میں ہے! اوپر مبھا اس کے سر پر تیل تھوپ رہی ہے اور اروٹی پنکھا جھول رہی ہے کہتے ہیں۔“  
”یعنی؟“

”اجی! یعنی شیر کے پنجے! دامونینے کی رتنا گری سے بدلتی ہو گئی!“ کہہ کر انتو شیٹھ نے آسمان کی طرف اُنگلی دکھائی۔

”ارے، ارے، ارے مجھے علوم نہیں ہوا۔“

”اجی صاحب، معلوم کیے ہو گا۔ دامونینا چل بسا کہہ کر کیا ریڈ یو میں خبر دینے والے ہیں؟ کیسے میں شائع ہو اتھا تکمیل سوانحی خاکہ۔ ملزار، شفیق، اور دھرم پالنے والا تھا ایسا لکھا تھا۔ دامونینا کہاں کا شفیق۔ جنازہ پر

عکس

پڑا ہوا تھا لیکن پیشانی پر کے بل برقرار! ایک رات گھر میں گرمی بہت پڑ رہی تھی اس لئے صحن میں سو گیا وہ دہیں مردہ حالت میں پایا گیا! نیک انسان۔ پچھلے سال آشاز کے دن ویلنٹھ لوک چلا گیا۔ رتنا گرمی میں دو پالکیاں نکلیں آشازی کو ایک وٹھو با کی اور دوسری دامونینا کی۔ آشازی کو وہ گیا اور وجہے دشمنی کے دن دتو پرانچے نے سرحد پار کر ڈالی۔ آخر زندگی کا سونا بن گیا۔ ایک گیا، دوسرا گیا اب تیرے کا انتظار کر رہا ہوں!

شرارتی انداز میں کندھا اڑاتے ہوئے انتو شیٹھ نے کہا۔

کم و بیش پانچ فٹ کی اونچائی، سُرخی مائل گوارنگ، چہرے پر باریک باریک داغ، بھوری ادھ کھلی آنکھیں، بڑھتی عمر کے لحاظ سے جھریاں پڑی ہوئیں، سر پر تیل کی کنارا بھری ہوئی ٹوپی، بدن پر گرتا، کمر میں گھنٹے تک دھوتی، پاؤں میں کوئی چپل، دانت کی آدمی صفحہ غائب اس لئے کھلے مسوڑھوں کو زبان لگا کر بولنے کی عادت اور ان سارے لوازمات کے ساتھ وزن لگ بھگ سو پونڈ۔ ان ساری عمر کے ساتھ ختم ہوتی چیزوں میں ایک بات تروتازہ یعنی ناک سے نکلتی ہوئی مگر صاف آواز اور سر پر پشت در پشت تھوپے ہوئے کھو پر میل تیل کی عطا کردہ وراثت میں آئی ہوئی روشن ذہنی!

انتو شیٹھ ہی نہیں، بلکہ اس گلی کے اس عمر کے سارے نمونے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ایک ہی راہ و رسم اور مسوڑ و نیم مسوڑ والے ہیں۔ زبان کو پاؤں سے لپٹ کر فراسانپ کی طرح کانے کی عادت سی پڑی ہوئی ہے۔ کسی کے اچھے ہونے کی خوشی و تسلی نہیں، بُرا ہونے کا دکھنیں۔ پیدا ہونے کی خوشی نہیں اور مرنے کا غم نہیں۔ گانے کا شوق نہیں، بے دلی بھی نہیں۔ کھانے میں لذت سے زیادہ شکم سیر ہونے کا واضح مقصد۔ زندگی کی سیدھی سادھی گاڑی، اس میں انجمن نہیں اس لئے گر گر کرنے کی نوبت نہیں آئی ہے اس لئے تیز رفتاری سے دوری نہیں۔ چال البتہ کون کے راستوں کی طرح بل کھاتی ہوئی نصیبوں میں اشو تھاما کے گھر کی آئئے کی دودھ کی پیالی! اس کے گھر میں آئئے کا دودھ بنا۔ یہاں بھگوان نے ناریل کا کلپ و رکش عطا کیا ہوا لیکن اس میں کھوپرے سے زیادہ اس کے خول سے لگاؤ!

موسم سرما میں بھبھی کی دو قم ناٹک کمپنی ناریل کے جھاپ کی بنی ناکیز میں "اچھی پیالہ" لے کر آئی تھی۔ ادا کار بس نام کے تھے۔ پہلا ایکٹ ہو گیا تھا، باہر سوڑے کی بوتلوں کی خرید و فروخت زوروں پر تھی۔ یہ پ کی دھیمی

روشنی میں انتو شیٹھ کی مورتی نظر آئی، انتو شیٹھ سیر و سفر کرنے والے مینجر سے بحث کر رہے تھے۔  
”بھیڑ کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہے!“

”پلان تو سارا خالی نظر آ رہا ہے۔ چھوڑتے ہیں کیا آدھے نکٹ میں؟“

”نہیں نہیں!“

”اجی صاحب نہیں نہیں کہہ کر جھٹک دے رہے کیوں چھپر جھٹکنے کی طرح؟ پہلا ایکٹ میں نے یہیں سے سُن ایا ہے۔ سندھو کے کردار میں کوئی دم نہیں ہے تمہارے ”لے گے زدھنی بُر بُر“، یعنی بالکل بے مزہ گایا ہوا۔  
بال گندھروں کا سنا تھا کیا؟ حبِ معمول آخر میں ”کیا“ جوڑتے ہوئے انتو شیٹھ نے کہا۔

مینجر بھی ذرا ناراض ہوا ”آپ ناٹک دیکھنے چلئے یہ ہمارا اصرار نہیں ہے۔“

گاؤں میں اصرار کے بورڈ تو آؤ یزاں کر دیے ہیں۔ اور کل گھر گھرا شہار کے نکڑوں کا نیوتا لئے گھوم رہے تھے  
تمہارے بینڈ والے! جناب یوں بھی خالی کرسیوں کو ناٹک دکھانا ہو گا۔ چار آنے میں طے کر دا لیئے۔“

”چار آنے میں دیکھنے کے لئے کیا ڈومباری کا کھیل ہے کیا؟“

”صاحب، وہ اچھا! پہلے وہ کھیل دکھاتا ہے پھر تھالی پھراتا ہے۔ تم اس طرح کرو، اگلے ”کشی یا تجو پدالا“  
کارنگ جم گیا تو تھالی میں چار آنے ڈال دوں گا۔“ پاس میں کھڑے لوگ ہنس پڑے اور مینجر برم ہوا۔  
انتہے میں انتو شیٹھ کی نظر میری جانب مڑی۔ نہ کاردا ماد صاحب۔۔۔!

”نمکار“

”کیا جم گیا ہے کیا ”اچھ پیالہ“؟

”ٹھیک ہے!“

”اعزازی پاس سے ہیں کیا آپ؟ باقی آپ بھی انھیں میں سے جو ہیں۔ ایک نائی دوسرے نائی کے داڑھی  
کے پیے نہیں لیتا ایسا کہا جاتا ہے۔“

”نہیں صاحب، دیکھنے یہ نکٹ ہے۔“

”پھر تھیک ہے“ اس نے زم سا جواب دیا آپ نے؟ پسیے گئے ہیں آپ نے؟ وہ سندھو کا کردار تو بالکل بیکار لگا مجھے۔

”صاحب سندھو کا کردار کیسا؟ کام کرنے والی وہ عورت ہے۔“

”کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کیسی اُس کی آواز اور کیسا اس کا روپ؟ دل میں ٹھان لے تو کر پرانھان لے سدھا کر کو سندھو کیسی؟ بالکل سندھو درگ ہے ماںون کا۔“

”لگتا ہے دیکھا ہے آپ نے نامک!“

”یونہی تھوڑا سا، اُس کو نے کے دو جھاپ (ناریل کے بنے چھپر) بازو سر کا کردیکھ لیا تھوڑی دیر! نہیں! اس سے تو بہتر دشاوتاری (رامائش وغیرہ کی جھانکیاں)۔“

کچھ وجہ نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی رائے کی پیک ڈال کر انتو شیٹھ نکل گئے۔ باقی اس طرح دن رات پیک ڈالتے اُن کی عمر بیت گئی میری اور انتو شیٹھ کی پیچان اتنے سال پر انی لیکن اُنکی گھر بیوی زندگی سے متعلق مجھے زیادہ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ اُن کے حلقو کے انا سانیا نے ایک بار کچھ معلومات مہیا کی تھی۔ کسی وقت بولتے بولتے اُن کے منہ سے انتو شیٹھ کے لڑ کے کاذک رآیا۔

”یعنی؟ انتو شیٹھ کو لڑ کا ہے؟“

”ہے؟ یعنی کیا؟ اچھا خاصاً کلکٹر ہے!“

”کلکٹر!“

”بھائیکل کے اشیش پر نکب جمع کرتا ہے۔“ چہرے کی جھر یا حرکت نہ دیتے ہوئے اتنا نہ کہا۔

”پھر والد کو مد نہیں کرتا کیا؟“

”اجی صاحب، کرتا ہے کبھی کبھی۔ اُسے بھی اُس کا سنوار ہے۔ اُس میں بھی بی بی سی آئی کو جی آئی پی کا ذہبہ جو دا ہوا۔۔۔“

”اس حلقو کے یہ خاص الفاظ جمع کر لیئے جائیں تو ایک الگ لغت تیار ہوگی۔ بی بی سی آئی کو جی آئی پی کا ذہبہ جوڑتا یعنی انٹر کا سٹ میر تج یعنی یہ ذہن میں آتے مجھے کچھ دیر ہوئی۔“

”کیا سمجھ میں آگیانا! اس لئے انتو شیٹھ کے لئے غسل وغیرہ کرنے کی مشکل پیش آتی ہے۔ لڑکے کے گھر میں کچھ مختلف معمول چلتا رہتا ہے ایسا کہتے ہیں۔ ہمارے انتو شیٹھ کے لئے یہ کیوں کر چلے گا! ایک بار ساری بے عزتی برداشت کر کے پوتے کا چہرہ دیکھنے گیا تھا۔ لیکن ایسے واپس لوٹ آیا مانو حساب غلط بننے گیا ہو۔ دہراتہ، دیوالی کو البتہ انتو شیٹھ کو مل جاتا ہے بذریعہ منی آرڈر والد کی چاہت کا عطیہ! پانچ دس روپیوں کا! اُس میں اظہارِ مسرت کرتے ہوئے کوکم موچھوں کو لگا کر گھی کہتے ہوئے پھرتا ہے۔ اور خواہ مخواہ ریز گاری بجاتے رہتا ہے چار دن جیب میں ہاتھ ڈالے۔“

”اجی صاحب، آخر نکٹ کلکٹر کی تxonah کیا ہوگی؟“

”txonah پی ٹلی، لیکن دوپنی چونی کالین دین چلتا رہتا ہے، ایسا کہتے ہیں۔ پنج جھوٹ دیو جانے۔ اور یوں چلتا ہی ہے! لیے تو لینے دیجئے۔۔۔ کیا؟ اجی، آٹھ آنے کھائے تو چوکون تاج جواہرات بھرا پہنا کر رہا۔ اگری کے ڈسٹرکٹ جیل میں ڈال دیتے ہیں اور ایک لاکھ کھائے تو گاندھی ٹوپی پہنا کر بھیج دیتے ہیں اسیبلی میں! لوگوں کا منتخب نمائندہ!“

سیاست تو انتو شیٹھ کے حلے کا پسندیدہ موضوع!۔ ہر سیاسی لیڈر پر اور اصول و ضوابط پر قیمتی رائے! کون میں قحط پڑ گیا تھا۔ یوں تو وہاں ہمیشہ ہی قحط، لیکن انتو شیٹھ کے لفظوں میں کہیں تو۔۔۔ فیمن آکٹ انوائے پاس ہوا ہوا، قحط زدہ علاقہ میں نہرو کا دورہ چل رہا تھا۔ گاؤں میں کافی ہاچل تھی۔ کسی نے شام کو انتو شیٹھ سے پوچھا، کیا انتو شیٹھ؟ تقریر کے وقت نظر نہیں آئے!

”کس کے نہرو کے! چھاث (نہیں)! ارے یہاں قحط پڑا ہوا ہے۔۔۔ تو تقریر یہ کس چیز کی دیتا ہے! چاول دے! یہ یعنی بھائے کی کھاڑی میں ڈوبنے والے دال دی کو وشویشور کی گھانی پر کھڑے رہ کر قرآن پڑھ کر سنانے جیسا ہے وہاں بول رہا ہے اور یہ یہاں۔۔۔ اس کا اسے فائدہ نہیں اور اس کا اسے! تم بڑے یقوق۔ آیا نہرو چلے دیکھنے! اور رتنا گیری میں اسے دکھانے لائق کیا ہے! بال گنگا دھر تک نے جنم لیا وہ کرہ کھیا؟ گنگا دھر پنت تک کو خواب میں دکھائی دیا تھا کیا رے۔۔۔ تیری بیوی کی کوکھ سے لوکمانیہ جنم لینے والا ہے! کس کی بھی کھیا دکھائی اور اڑادی بات کہ تک نے اس کھیا پر پہلی بار شیاں کی آواز نکالی

تھی۔ ثبوت کیا ہے؟ کیا تلک کی ماں کی زچگلی کرنے والی دایا بنی تھی گواہ؟ تلک کی بات چھوڑ دے سوال بیت گئے اس کے جنم کو۔ تو نے جہاں جنم لیا وہ کمرہ تیری والدہ ماجدہ بتا سکیں گی کیا؟ بڑھیا سے پوچھا آگھر جا کے پھر مجھے سنا تلک کے اور نہرو کے قصے۔

میرے سامنے ہمیشہ یہ سوال رہتا کہ ان حضرات کے احترام کے کون سے مقامات ہیں؟ گاؤں میں پنڈت آیا کہ اُسے ”پڑھک“ کہہ کر مذاق اڑایا جاتا۔ ”بازار میں جا کر پیے کالیموں لانے کو کہہ کھنے کے قریب لا بسیری میں میں جائیگا اور لیموں مانگے گا۔“! کس کا لڑکا پروفیسر ہو گیا ہے سنتے ہی انتو شیٹھ فوراً کہہ اُٹھئے، ”سرکس کا کیا صاحب؟ پہلے ایک چھترے پروفیسر تھا۔“ کسی نے نئی ڈکان ڈالی کہ ”دیوالیہ کی عرضی ابھی سے منگوا کر رکھ کہہ دیں!“ یہ آشیرواد۔ زندگی کے کس اصول کا عرق یہ گروپ پی گیا ہے بھگوان جانے۔ ان میں سے نصف سے زائد لوگ منی آرڈر پر زندگی بتاتے رہتے ہیں اور ان میں سے کچھ پیے بچا کر مقدمات لڑاتے رہتے ہیں۔ ہر کسی کی مقرر تاریخ۔ وسیع سا گر کا کنارہ ہے، ناریل کے بن ہیں، سپاری کے باغات ہیں، سب کچھ ہے! لیکن وسیع اقلیٰ کو چھیدتی ہے غربت اور رہ جاتا ہے بھیانک بنسی و مذاق کا گہرا خول!

کسی بات پر گاندھی جی کا ذکر چھیڑ گیا۔ انتو شیٹھ نے اپنی تقریر شروع کر دی۔ ”صاحب، کیسا گاندھی! جگ بھر پھر ایک رتنا گری میں کچھ زیادہ آیا بھی نہیں۔ پکاؤہ! اُسے اچھی طرح معلوم تھا۔ یہاں اس کی دھوتی کی سراہنا نہیں نہ ہی لکڑی کی۔ ہم یہاں بھی دھوتی والے اور اس سے زیادہ برہنہ جسم والے! سوت وغیرہ کی کوئی اہمیت نہیں ہاں! ہمارا شمشوٹھ تا حیات جنیو کا سوت نکالتے آیا ہے۔ برٹش سرکار کا تو چھوڑ یہ لیکن رتنا گیری کا گلکن گلکھر تک نہیں گھبرا یا! تیرا ہتھیار بھوک ہڑتاں کا! یہاں نیم کوکن بھوکا! ہمیشہ گھنی کا کھانے والے کو بھوکوں کا کیا درد؟ ہمیں کیسے ہو! نہیں۔ آدمی ہو گا بڑا۔۔۔ لیکن ہمارے حساب سے اُس کی بڑائی کو کس کھاتے میں درج کیا جائے؟ اور سوراجیہ کا کہیں تو اس کا تعلق گاندھی سے نہیں تلک سے نہیں اور سا اور کر سے تک نہیں۔“

”یعنی سوراجیہ کیا آسمان سے ٹپک پڑا؟“

”وہ کہاں ٹپک پڑا اُس کی جانچ آپ کریں۔ لیکن انگریز گیا وہ بیزار ہو کر۔ اجی جناب لوٹنے جیسا کیا رہ گیا تھا

یہاں؟ دھنڈہ نقصان کے مد میں جانے لگا۔ پھونکنے کا پیشہ دیوالیہ! کمھار منکے لے کر گیا، تم پھونکتے رہو گو بر کا ذہیر! یہ سب عجیب سابن گیا ہے۔ حکومت انگریزوں کی نہیں، ہندو کی نہیں اور جتنا کی بھی نہیں۔ حکومت ہے ویشویشور کی!“

”پھر تمھارا ویشویشور انگریزوں کے قبضے میں کیسے گیا؟“

”بیوقوف ہیں کیا آپ! ویشویشور مضبوطی سے ہے راجیوڑے پر، اجی ایک کھیل کر دکھایا انہوں نے“

”ڈیڑھ سال کی غلامی کا کیا کھیل؟“

”اجی، ڈیڑھ سال تمھارے! ہر ہم دیو کی رست واج کا سینڈ کا نٹا تک نہیں سر کتا ہزاروں سال بیتے بغیر!“  
کوکن کے اس درمیانی گلی کے برآمدے میں، اطراف کے کالے ناریل کے سائے ہلتے وقت قدیل کی روشنی میں وہ تھکے ہوئے سوکھے چہرے اصولوں کی بات کرنے لگ جائیں تو دل دہل جاتا ہے ”اجی جناب سماج واد کی تو صرف افواہیں ہیں افواہیں! اجی ایک آم کا پتہ تک نہیں رہتا وسرے کی طرح۔ ہر ہم دیو تا کے گھر کا ہر برتن نرالا۔ سب لوگوں کے نصیب کیوں کر ہونگے یکساں! الجھر کے لئے تصور کیجئے کہ سماج واد آگیا ہے۔  
وہ رتنا گری کا گاؤں گاندھی سیٹیاں پھونک پھونک کر کہتا ہے ویسے آئی کوکن ریلوے اور گئی پانڈو گرو گھر کے پچھواڑے سے۔ اس لئے کیا لوئے پانڈیا کے کندھوں کو ہاتھ کے کھونٹ نکل آئیں گے کیا؟ اور ہاتھ نہیں ہے اس لئے جوتے گا اس کی زمین اور نظر آئیگی اس کی تھیلی۔ تمھارے اس راج میں لو لا پانڈو کیا آگائے گا اور کیسے؟ وہ تو ویسا ہی رہیگا! سوراجیہ آیا اس لئے ہری ساٹھے کی ترچھی آنکھ سیدھی نہیں ہوئی اور مہادیو گڑ بو لے کی تو نداندر نہیں گئی یہ دامیں باعیں رہیگا ہی سماج میں۔ اجی، رام راجیہ میں بھی ماروتی کی دم اکھاڑ کر اپنی پیٹھ سے نہیں جوڑی۔ یہ زہی رہ گیا اور وہ وازر ہی رہ گیا۔“

ایسے وقت انٹو شیٹھ کی زبان پر سرسوتی رقص کرتی ہے۔

”برابر ہے!“

”یوں ہی مُنہ دیکھا برابر ہے مت کہیئے اس شام راؤ مرکثیا کی طرح! غلطی ہو رہی ہو تو کان کھینچئے! نم مجھ سے چھوٹے یہ درست لیکن علم میں مجھ سے بڑے ہیں۔“

انتوشیٹھ کی اس طرح کی بات میں صرف ٹیز حامزاح نہیں رہتا۔ ان کا کہیں تو کچھ تو جلتا رہتا ہے۔ پچھلے چار پانچ سالوں میں رتناگری میں کچھ زیادہ جانے کا موقع ہی نہیں آیا۔ اب وہاں بھلی آئی، کالج آیا، ٹارروڈ بنے۔ میں دو تین سال پہلے گیا اس وقت انتوشیٹھ سے کہا۔

”انتوشیٹھ، رتناگری جھگگ میں آپ کی! بھلی کے دیے آئے۔ آپ کے گھر میں آئی یا نہیں بھلی؟“  
”نہیں تو۔ تاریکی ہے وہ اچھی ہے! کل جھگگ روشنی پھیلی تو دیکھیں گے کیا؟ غربتِ مفلسی ہی نا؟ اجی صاحب، پوپلے نکلی ہوئی دیواروں اور نیکتے کھپر میل دیکھنے کے لئے بھلی کس لئے۔ ہماری مفلسی اندر ہیرے میں غرق اچھی!“۔

انتوشیٹھ من مراد نہیں پڑے۔ اس بارہ انتوں کا تقریباً اُتو گوگھیا ہوا ہوا نظر آیا اس کے علاوہ اُذے کے ایک دو لوگ ”نج دھام“ (نیند دھام) جانے کا علم ہوا۔ کب نظر نہ آنے والی ایک اپناستیت اور مٹھاں کی جھلک انتو شیٹھ کی باتوں میں مجھے دکھائی دی۔ اُذے پر کی خالی نشیتیں ان کے دل میں کہیں تو گھر کر رہی ہوں گی  
”جو گلکیر کے لڑکے کا تبادلہ ہو کر دلی میں اعلیٰ عہدے پر گیا ہے۔“ انتوشیٹھ خود ہو کر کہہ رہے تھے۔ بوڑھے باپ کو کاشی و شویشور، ہری دوار، رشی کیش لیجا کر لے آیا ہے۔ شمبو جو گلکیر نے زوردار ماونڈ (یا ترا کے بعد کی جانے والی گنگا پوچھا) کا اہتمام کیا۔ گنگا کے پانی کا چھوٹا سا گھڑا سیل بند کر کے یاد سے میرے لئے لے آیا!  
اگلی بار آپ آئیں گے تو اُس کا سیل توڑ کر گھڑا اوندھا ہمارے منہ میں گرا ہوا نظر آیا گا داما و صاحب۔“ پہلی ملاقات کا طرزِ تخطاب اب تک برقرار تھا۔ اس کے بعد دوبارہ پار سال رتناگری جانے کا موقع آیا۔ انتوشیٹھ کا گھر کا گنگا جل کا گھڑا خوش قسمتی سے سیل بند ہی تھا۔

”واہ واہ! کاگنر پیچولیشن داما و صاحب! ہمیں معلوم ہو گیا ہے۔ جا کر آئیے صاحب، ایک رویست ہے۔  
اب انگریزی میں بات کرنی چاہئے آپ سے۔“  
”کس طرح کی رویست؟“

”آتنا کوہ نور ہیراد کیھا آئیے۔ میری یونہی وہ خواہش رہ گئی ہے جناب۔ پنڈ (موت کے بعد کوؤں کو کھلایا جانے والا کھانا) کو کوئا نہ چھوئے تو کوہ نور کوہ نور کہیئے۔ وہ چھوئے گا!“

واپس لوٹنے پر بتا دیجئے کیا نظر آتا ہے وہ لندن، پیرس سب دیکھا آئے۔ مجھے خواہ مخواہ ان کے پیر پڑنے کی خواہش ہوئی۔ میں راستے ہی میں جنگ کرنے کا کارکیا۔ ”طویل عمر پائیں آپ! عقیدت مند ہیں، اس لئے کامیابی آپ کے قدم چوتھی ہے۔“

ابھی میں اجازت لے کر چار قدم ہی چلا ہوں گا کہ فوراً آواز سنائی دی۔

”او داما دصاحب“

”کیا انتو شیٹھ“

”جار ہے ہیں وہ اکیلے یا اہلیہ کے ساتھ؟“

”ہم دونوں بھی جار ہے ہیں۔“

”یا اچھا کیا آپ نے! خواہ مخواہ ایک کیڑا رونما ہوا ذہن میں۔ کہا، پر دلیں میں تعلیم کی غرض سے جار ہے ہیں۔ دیویانی کا قصہ یاد آیا، کیا؟ ہماری بچی سے بھی آشیرواد کہنا ہاں!“

آپ کی قسم اس کی وجہ سے ہے۔ تمھیں اس لئے کہہ رہا ہوں۔ دل میں رکھئے، کہیں کہیئے گا نہیں۔ چالیس برس پہلے ہماری یہ چل بسی۔ دروازے کا آپس آم کا درخت اُس وقت سے اس لمحے تک بے بور رہا۔ سیکڑوں کی تعداد میں آم پایا ہے ایک وقت اس درخت کا۔ لیکن قسم کس راہ پر چل پڑتی ہے دیکھئے۔ خیر! خیریت سے ہوا آئے۔ یہاں سے رو انگلی کب؟“

”کل صحیح ایسی ٹی سے جائیں گے!“

”ڈا رکٹ ممبئی کیا؟“

”جی ہاں!“

”یا اچھا کیا آپ نے! ایک بارہ سفر طے ہو جائے تو انسان نے پوری دنیا کی سیر کر لینا چاہیے، پرسوں اور کی گلی کا تانیا جوگ جا کر آیا، اب تک بڑے یوں کا حساب جوڑ رہا ہے سات آٹھ بڑے یاں کھو گئیں ایسی ٹی میں،“ انتو شیٹھ پورا منہ کھول کر بنس رہے تھے۔ اب اُس منہ میں ایک ہی دانت چمک رہا تھا۔

صحیح پائچ بجے ایسی ٹی اشینڈ پر ”داما دصاحب“ یا انتو شیٹھ کی زور دار آواز سنائی دی۔ میں حیران رہ گیا۔ انتو

عکس

شیٹھ نے وید کی پڑیا کی طرح ایک پڑیا میرے ہاتھوں میں دی۔  
”آپ کا اعتقاد نہیں، یہ میں جانتا ہوں لیکن اتنی پڑیا یار ہے تجھے آپ کی جیب میں، وشویشور کا انگارہ ہے  
طیارے کا سفر ہو گا آپ کا یہ معلوم ہوا وکیل صاحب کے ذریعے۔ اتنی پڑیا بھاری نہیں جیب کے لیئے۔“  
ایسی روائی روانہ ہوئی اور ان تو شیٹھ نے ہمارے خاندان کے ساتھ اپنا گرتا اور پرانھا کراپنی نیم وا بوڑھی آنکھیں  
پوچھیں، اُس دھندے اجائے میں ان کا پیٹھ سے ملا ہوا پیٹ میری آنکھوں پر خواہ مخواہ ضرب لگا گیا۔  
کوکن کے کٹھل کی طرح وہاں کے لوگوں میں بھی۔۔۔۔۔ بہت زیادہ پکے بغیر مشاہس نہیں پیدا  
ہوتی ان میں!۔۔۔۔۔ ☆ ☆ ☆

### (ویکتی آنی ولی)

## سکھارام گلنے

”سریہ پڑے۔۔۔ سکھارام گلنے نے ایک پڑا یا میرے ہاتھوں پر رکھ دی۔۔۔  
”کس لیئے رے؟۔۔۔

”ذہانت کے ٹیکٹ میں کامیاب ہو گیا۔۔۔

”خوب!“ ذہانت کے امتحان کی سطح میرے ذہن میں آگئی۔۔۔ ”کتنے فیصد نمبر حاصل کئے؟“

”اب تک نمبرات کا او سط معلوم نہیں ہوا ہے۔۔۔ معلوم ہونے پر بتا دوں گا۔۔۔ لیکن ۶۵ فیصد تو ملے چاہیئے۔۔۔

سکھارام گلنے دانشوارانہ مراثی بولتا ہے۔۔۔ بارش کے دنوں میں رستے میں بھیکے ہوئے لا چار کئے کو انٹھا کر گھر میں لے آئیں، ویسا ہی اس گلنے کا اور میرا معاملہ ہوا۔۔۔ جن کی طرف بھی نظر انھائی تو سوائے انتہائی ہمدردی کے اور کوئی جذبہ یا احساس پیدا نہیں ہوتا ایسے لاائق ہمدردی والوں میں وہ ایک ہے۔۔۔ باقی لوگ تو نہ جانے کیسے کیسے چہرے پر تاثرات پیدا کر کے جنم لیتے ہیں! کوئی سدا یتیم خانے کا چندہ مانگنے آئے ویسا، کوئی ابھی ابھی بس پکڑنے میں ناکام رہا ہو جیسا، کوئی ہمیشہ کا تعجب میں پڑا ہوا، تو کوئی خواہ مخواہ خیالات میں مگن، تو کوئی بے وجہ پیشانی پر کھڑے بل ڈالے ہوئے ہو۔۔۔ سکھارام گلنے کے چہرے پر ہوانکے ہوئے فٹ بال کا تاثر ہے اُس کا پہلا درشن ہوا وہ بھی اسی انداز میں۔۔۔ درحقیقت یہ لڑکا میرا کوئی بھی نہیں ہے۔۔۔ میرے ایک تقریر کے بعد میری اور اس کی ملاقات ہوئی۔۔۔ یہ اُس وقت میڑک کے کلاس میں پڑھتا تھا۔۔۔ آدھے پا جائے میں سفید گرتا ڈالا ہوا، ناک کی سیدھی میں گاندھی ٹوپی پہنے ہوئے، چھوٹی سی کچھ تاثر نہ دیتی ہوئی آنکھیں، کالارنگ، بے

ترتیب دانت۔۔۔ اس رعب سے یہ لڑکا اُس ہال کے دروازے پر کھڑا تھا۔ میں ہار اور گلدستے لئے باہر آیا اور اُس پر نظر پڑی۔ اُس نے بہت ہی ادب کے ساتھ نمسکار کیا۔

”آٹوگراف“۔۔۔ اپنی بیاض آگے بڑھاتے ہوئے وہ بولا۔

”نبیس نہیں، میں آٹوگراف وغیرہ نہیں دیتا“۔۔۔ میں نے یوں ہی غصے کے انداز میں کہا۔

”جیسی آپ کی مرضی“۔

اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ دیوتا کو نمسکار کیا جائے بالکل اُس طرح۔ دوسرے کسی نے مجھے اس طرح نمسکار کیا ہوتا تو میں غصے میں آ جاتا۔ البتہ سکھارام گلنے کا نمسکار! تنا خلوص بھرا تھا کہ وہ نمسکار مجھے کہیں بھی جا کر چھڑ گیا۔ آٹوگراف دینے سے انکار کا یہ کوئی میرا پہلا موقع نہیں تھا، لیکن نہ دینے میں کوئی مطلب چھپا ہے ایسا بھی نہیں ہے۔ پر کبھی بھارتی شے پتوں کے سامنے خواہ مخواہ پابند اصول بن جانے کا شوق چراتا ہے۔ سکھارام گلنے کو نے میں کھڑا تھا اتنے میں ادارے کے سیکریٹری ایک بڑا جنرلیکر میرے سامنے آئے۔ ”ادارے میں آئے جملہ چھوٹے بڑے مہماںوں کے آٹوگراف ہم اس میں لیتے ہیں۔ پونے کے پونے میں رہتے ہوئے بھی آپ سے ملاقات کا آج ہی موقع آیا ہے۔“

میں نے وہ رجسٹر دیکھنا شروع کر دیا۔ طرح طرح کے لوگوں نے ادارہ دیکھ کر اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ میں بھی اپنی بے اطمینانی کا اظہار کروں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا اس لئے دو چار جملوں میں اظہار اطمینان کر دالا اُس کے بعد منظمه کمیٹی کے ممبران کے ساتھ چائے پانی (گلوکو بسکٹ، چوڑا اور سکلے !!) ہوتی۔ اراکین کا موزوں مذاق بھی برداشت کر رہا تھا۔ لیکن کھڑکی کے باہر اپنی بیاض لئے کھڑا سکھارام گلنے خواہ مخواہ مجھے بے چین کرنے لگ گیا تھا بالکل قابلِ رحم نظروں سے وہ اندر دیکھ رہا تھا۔ اُس عمارت کے لمبے چوڑے دالان میں ایک کونے میں یہ چار سائز ہے چار فٹ اونچائی والی جان۔۔۔ ایک آدھ جھاڑو رکھی جائے ویسے کھڑا تھا۔ اُس لڑکے کی طرف اب نہیں دیکھوں گا ایسا دس بارہ مرتبہ تہیہ کر لیا لیکن نظر اس طرف مُرد ہی جاتی تھی۔ کچھ دیر بعد اُس لڑکے کا وہاں اس طرح کھڑا رہنا میرے لئے ناقابلِ برداشت ہو گیا اور میں نے سیکریٹری صاحب سے اُسے بلالانے کہدیا۔

”کے؟ سکھیا کو؟ سیکریٹری نے تعجب سے کہا؟“

”مجھے اس کا نام نہیں معلوم۔ لیکن وہ جو وہاں کھڑا ہے وہ۔“

”وہی سکھیا ہے۔ ارے اے گٹھیا۔“

اتی دوری سے بھی سکھارام گٹھنے کا سہم جانا مجھے نظر آسکا، اتنی شدت سے وہ سہم گیا۔ کسی مجرم کی طرح آکر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”کیا نام ہے تمہارا بیٹا؟“ میں نے آواز میں ممکنہ حد تک نرمی پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔

”سکھارام آپا جی گٹھنے۔“

”اس کا خط بہت ہی خوبصورت! ہماری تقریری سلسلے کا اشتہار، بورڈ یہی لکھتا ہے۔ والد کی سائنس بورڈ پینٹر کی دکان ہے، آپا بلونٹ چوک میں۔“

”ارے، تیرا خط جب اتنا خوبصورت ہے، پھر آٹو گراف کیوں جمع کرتا ہے؟“ اس بات میں کوئی خاص ایسا پہلو نہ تھا جس پر زور سے ہنا جائے، لیکن مجلسِ منظمه کے سبھی اراکین ہنس پڑے۔ ”کس کس کے دستخط جمع کئے ہیں تو نے، دیکھوں تو سہی۔“

”میں صرف ساہتیہ کاروں کے ہی آٹو گراف لیتا ہوں،“ آٹو گراف بک میرے ہاتھوں میں دیتے ہوئے سکھارام گٹھنے نے کہا۔ میں اس کی دستخط والی بک دیکھنے لگ گیا۔ ہر قلم کار کے تخلیقات سے ایک ایک جملہ چمن کر گٹھنے نے اس کے نیچے اس ساہتیہ کار کی دستخط لی تھی۔ میں نے آخری اپنا صفحہ کھولا، وہاں کے جملے کے نیچے دستخط نہیں تھی۔

”یہ جملہ کس کا ہے؟“

”آپ ہی کے ایک ڈرامے سے ہے!“ سکھارام گٹھنے انتہائی احترام سے بولا۔ متن سے ہٹ کر ڈھونڈ کر نکالا ہوا میرا ہی فقرہ، جملہ پڑھتے ہوئے خود مجھے اپنے آپ پر حرم آیا۔

”یہ عبارت تو نے کیوں پسند کی بیٹا؟“

”یہ فقرہ، جملہ مجھے زندگی جینے کا اصول لگتا ہے۔“

”باپ رے!“ میں نے دل میں کہا۔ اس چار سائز ہے چار فٹ لمبے ڈبلے پتلے جسم سے زندگی سے متعلقہ اصول وغیرہ کی توقع نہیں تھی۔ میں سکھارام کے چہرے کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ منتظر کمینی کے ایک عمر رکن پر زندگی سے متعلقہ اصول، ان الفاظ کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوا ہوگا۔ اُس نے گٹنے کو کری پر بیٹھنے کے لئے کہا۔

”کیوں کر؟“ تو نے میری کتاب میں پڑھی ہیں کیا؟“۔

”آپ کی طبع شدہ ایک ایک سطر میں نے پڑھی ہے آپ اور سانے گرو جی میرے آدرس قلم کا رہ ہیں۔“۔  
”ارے، لیکن پچھلی بار وہ کون آئے تھے انھیں تو نے وہ اور سانے گرو جی کہا تھا۔“۔

سیکریٹری اس شخص خاص کی دسترس نہ ہوا یا اُن کھانا قانون ہوگا۔ دراصل گٹنے نے دوسرے کسی قلم کا رکوب بھی سانے گرو جی کے ساتھ بٹھا دیا ہوگا۔ بہت ممکن ہے آئندہ ایک دو ہفتوں میں کوئی تیسرا قلم کا رہ آجائے تو اس کی اور سانے گرو جی کی جوڑی بھی بن جائے۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ گٹنے ابھی سانے گرو جی کی کلاس سے باہر نکلا نہیں تھا، البتہ کھڑکی باہر کے دوسرے مناظر اسے پسند آنے لگ گئے تھے سیکریٹری کے کہنے سے سکھارام سکتے میں پڑ گیا۔ میں نے موضوع بدلتے کے خیال سے کہا۔ ”کس جماعت میں پڑھ رہے ہو؟“۔

”اسال ایس ایس کا امتحان دینے والا ہوں۔“

”ایسا!“ میں نے اسکی وہ مختلف ادیبوں کے زندگی سے متعلق خیالات سے بھری بیاض کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔ دستخط کے لئے گہرا گہرا کرانے والا سکھارام گٹنے یہ کوئی پہلائی نہیں تھا۔ فلاں فلاں شخص یہ دستخط لینے کے قابل ہے یہ غلط فہمی کسی افواہ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ پر دستخط جمع کرنے والے اکثر بچوں اور بچیوں کے چہرے پر ایک شند مزاجی سی جھلکتی ہے۔ بیاض بڑھاتے ہوئے چہرے پر جوتا ثپیدا کیا جاتا ہے وہ احترام کا اعلیٰ ڈرامائی رنگ ہوتا ہے، ہمیشہ دستخط دینے والوں کے وہ دھیان میں آ جاتا ہے سکھارام گٹنے کے چہرے کا ہر ریشمہ بدرجہ کمال صحیح تھا۔ وہ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں، کچھ جھونٹا، پوشیدہ رکھا ہوا، دھوکہ دہی کا تاثر دینے سے قاصر تھیں۔

”آپ نے آٹوگراف دیے تو میں زندگی بھر آپ کا احسان مندر ہوں گا۔“

سکھارام گلنے کے منہ سے وہ جملے سنتے ہوئے مجھے لگا مانو اس کے منہ میں دانت نہیں چھاپ خانے کی کلیں بٹھائی ہوئی ہیں۔ یہ لڑکا بدرجہ کمال چھپا ہوا بولتا ہے، لیکن زبان کی وہ طباعت بدرجہ اتم پچ لگتی ہے۔ میں نے اس کی بیاض کھول کر خاموشی سے اس کی زندگی سے متعلق عبارت کے نیچے دستخط کر دی۔ اس کے بعد سکھارام گلنے کے نمسکار سے میرے دل میں بالکل ایک ہوک سی اٹھی۔ بُرے حالات کے مارے لوگ شنی کا اثر زائل کرنے والے ماروتی کوتک اتنا تھہ دل اور پُراز جذبات نمسکار نہیں کرتے ہوں گے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنی شرمندگی محسوس نہیں کی تھی۔ سکھارام گلنے، یہ قسم میری زندگی کے کھاتے بھی میں اس دن درج کر دی گئی۔ اس واقع کواب بہت سال بیت گئے ہیں۔ سکھارام گلنے اُس کے بعد میرے گھر آنے جانے لگا۔ پہلی بار آیا تو دہرے کے دن سونا تقسیم کرنے کے لئے۔ میرے کچھ دوست گھر آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی میرا لکھا ہوا ایک جملہ تک نہیں پڑھا تھا اور اس کے آگے بھی وہ نہیں پڑھیں گے۔ اس لئے دوستی بے خطر والوں کے ساتھ یوں بھی رابطہ کم ہی رہا ہے اس لئے تن تہارہ جاؤں تو یہ ادب سے متعلق باتیں برداشت کر سکتا ہوں۔ لیکن میرے ان خاص دوستوں کے اڈے میں مجھے میرا قاری تو کیا روشنی بھی نہیں بھاتی۔ سکھارام گلنے اندر آیا اور اس نے بہت ہی احترام کے ساتھ میرے پاؤں کو ہاتھ لگا کر نمسکار کر کے مجھے دہرے کا سونا دیا۔ میرے نکتے دوست یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

”آپ نے شاید مجھے نہیں پہچانا ہوگا۔“

”واہ واہ! پہچان تو لیا! گذشتہ دنوں ایکبار آپ میری تقریر سننے آئے تھے۔“

”یہ سورج نے جگنو کو یاد رکھنے جیسا ہے؟“ گلنے نے حسب عادت ایک تحریر شدہ جملہ کہدیا۔ اب اس لڑکے کو کیا کیا جائے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ٹھیک ہے، بالخصوص سونا دینے کی غرض سے آیا ہوا۔ اسے ایک پیالی چائے تو دینی چاہئے تھی۔ گلنے کے چہرے کی بھلکتی بھاؤنا (اظہار عقیدت) سے میں حیران ہو گیا تھا۔

”مجھے آپ سے چند سوالات پوچھنے تھے۔“

”ہم دوبارہ پھر ملیں گے چلے گا کیا؟“

”کب آؤں؟ اپنی تخلیقی مصروفیات کے اوقات کے علاوہ کوئی بھی اوقات بتا دیجئے گا!“

مجھے اُسے چیخ کر کہوں ایسا لگا۔ ”لڑکے۔۔۔ ارے انسانوں کی طرح تو بول، تیری زبان کو یہ چھپائی والا اطرز کس گدھے نے دیا! تخلیقی عمل کا کون سر کا وقت؟۔۔۔“ لیکن ایسا کچھ بھی میں نے کہا نہیں۔ گھٹنے کی آنکھوں میں چھپن شہباد بے چینی بسی ہوئی تھی۔ بولتے وقت اُس کی آنکھیں ایسی کچھ ہو جاتیں، اُس کی پیشانی اور گلے کی رگیں کچھ عجیب طریقے سے تن جاتیں، کہ ایسی بے حسی میں اُس لڑکے نے کسی کو گالی بھی دی ہوتی تو گالی کھانے والا گالی دینے والے پر رحم کرتا۔ یہاں تو اُس کی زبان پر موجود سرسوتی نے مراثی زبان کا ”کلاس“ کھول دیا تھا۔

"یدیکھیئے، اگلے ہفتے کسی شام تشریف لے آئے ۔"

”کوئی مخصوص دن بتا سکیں گے کیا آپ؟ نہیں بتا سکیں گے تب بھی چل جائے گا۔ میں روز آنہ آیا کروں گا کوشش یہ تجیقی عمل کے لیے زندگی عطا کرنے والی ہو اے ایسا گڑ چکیر کہہ ہی چکے ہیں۔“

۱۷

"س-ت۔ گلہ چکر۔۔۔۔۔۔ کیتھکی پولی یڑلی، کامصفیف "

"ایسا! گردچیکر نام کا کوئی مراثی میں ادیب ہے، اس کا مجھے علم نہ تھا۔ اور گٹنے کو، کیتھی پولی پڑلی " (یہ ناتک تھا، ناول تھا، یا اور کچھ تھا بھگوان جانے) اس کتاب کے فقرے از بر تھے۔ اس گٹنے کا معاملہ ہاتھ سے باہر گیا ہوا تھا۔

گئے اسی طرح تھوڑوں پر آتا رہا۔ سکراتی کے کارڈ، دیوالی کی تہنیت، نئے سال کی نیک خواہشات بلا ناغہ بھیجا رہا میری تخلیق کہیں بھی شائع ہو جائے تو اس کو پڑھنے کی اطلاع اپنی خوبصورت تحریر میں بھیجتا۔ اس کے بعد ایک شام سکھارام گئے گھر پر آیا، ہمیشہ کی طرح ناک کی سیدھی میں ٹوپی، ہاتھ میں تھلی، ایسا دُبلا پتلا اور آنکھوں میں عقیدت مندی سے نچاہر ہونے والے تاثر لئے دروازے یہ کھڑا رہا۔

آئے! ” میں نے اسے اندر بلایا۔

” آپ کی سادھنا میں مخل تو نہیں ہوا میں؟ ”

” جناب سادھنا کیسی۔ سادھنا کیسی۔ آرام کرتے پڑا ہوا تھا۔ ”

” فکر و افکار میں تو ڈوبے ہوئے تو نہیں تھے تھے؟ ”

” نہیں جی! فکر و تخيیل کچھ بھی نہیں۔ ہاں کہیے، چائے لیں گے؟ ”

” نہیں چاہیے۔ میں چائے نہیں پیتا۔ یہ جان پیدا کرنے والی مشروبات سے میں پہلے سے دور ہی دور رہتا ہوں۔ ”

اس لڑکے کے سر میں پانی کے فوارے چھوڑ کر اس میں سے یہ ساری ادبی لفظیات کے جال دھوکر نکالے جا سکتے ہیں کیا اس خیال میں پڑ گیا۔

” اجی چائے یہ یہ جان پیدا کرنے والا مشروب ہے کس نے کہا؟ ”

” اُنتی ماہنامہ کے وجہے دشی نمبر میں چوکھرے گرو جی کا مضمون ہے ” زندگی کی ترقی کے چھ اقدام ! ”

” زندگی کی ترقی کے چھ اقدام ” یہ الفاظ گنٹے کے میز ہے میز ہے دانتوں سے بچوں کی جیبیں الٹ دینے پر جھٹرح گوٹیاں گر جاتی ہیں اس طرح وہ گر پڑے۔

” آپ میری مانیں گے کیا گئے۔ ایسے مضمایں مت پڑھا کیجئے۔ ”

” میں اس سلسلے میں آپ کی رہبری حاصل کروں اس غرض سے یہاں آیا تھا۔ ”

” رہبری کیسی؟ ”

” مجھے میرا مطالعہ و سعی کرنا ہے۔ صحیح مطالعہ کے بنا اپنی بات میں وزن پیدا نہیں ہوتا۔ ”

” کس گدھے نے کہا تم سے؟ ”

” گئنے سہم گیا۔ اس کے انگنٹ گرو جی میں سے کسی ایک گرو جی کی دھوتی پر انجائے میں میں نے ہاتھ رکھ دیا تھا۔ گئنے خاموش کھڑا تھا۔ اُس کی ان قابلِ رحم آنکھوں میں اشک آنا باقی تھا۔ مجھے بھی اپنے الفاظ پر غصہ آگیا تھا۔ لیکن گئنے کے ایک ایک جملے میرا دل تلاش کر رہے تھے۔ اس لڑکے کو کس طرح قابو میں کیا جائے میں اس سوچ میں پڑ گیا تھا۔

” یہ دیکھے، پی ہی لجیے تھوڑی چائے۔ اس سے قبل کبھی پی تو ہوگی نا؟ ”

” ہاں پہلے پیا کرتا تھا ” کسی بڑے جرم کا اقبال کیا جائے اس طرح منہ بنانے کرنے نے کہا۔

میرے کہنے کے مطابق اس نے چائے پی لی۔ اس کے کئی اساتذہ میں سے ایک میں بھی تھا۔ چائے پینے ہوئے اس کے چہرے کی جانب دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ سرکس میں شیر کی تھالی میں بکری کو کھانا لگاتے ہیں اس وقت بکری کا چہرہ شاید اس طرح بن جاتا ہوگا۔ باقی گھنے اور بکری میں کچھ تو مناسبت تھی بکری درختوں کے پتے کھاتی ہے یہ کتابوں کے اور اق کھاتا ہے۔ میں نے اسے جو جو کتابیں یاد آسکتی تھیں اس کی فہرست تیار کر کے دیدی۔ وہ فہرست پڑھتے وقت اس کے چہرے پر عجیب اطمینان کا تاثر پیدا ہو گیا تھا۔ کچھ میں کے لگ بھگ کتابوں کی فہرست تھی۔

” یہ میں نے پڑھی ہیں۔ ! ”

” ساری؟ ” میں کری سے لڑکنے کے قریب تھا۔

” ہاں لیکن پھر سے ایک بار پڑھ ڈالوں گا۔ ”

” نہیں نہیں ۔ ۔ ۔ دوبارہ کیوں پڑھیں گے؟ ” دراصل مجھے اس سے یہ کہنا چاہیئے تھا کہ، اے دوست آئندہ پانچ سالوں تک روزانہ کا اخبار تک مت پڑھ۔

” بھسما ” نام کا ایک مرض ہوتا ہے کہتے ہیں اس میں انسانوں کو ” کھاؤں کھاؤں ” کا دورہ پڑتا ہے اور کھالیا کہ بھسما، کھایا کہ بھسما، ایسی مریض کی حالت ہو جاتی ہے۔ گھنے کو ایسا ہی کتابوں کا بھسما روگ لگ گیا تھا۔ اس لڑکے کا کیا جائے میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ آخر میں نے الماری کھولی ان میں کی کتابیں دیکھ کر کھلونوں کی دکان پر جانے کے بعد بچوں کے چہرے بن جاتے ہیں ویسا اس کا چہرہ بن گیا۔

” ان میں سے جو چاہے کتابیں لے جاؤ ” ” وہاں پنج پر تکلیف آسو ” ( پنج تیرا کلیان ہو ) کے انداز میں میں نے کہا۔

” ان کا مطالعہ کرنے کی خواہش ہے میری۔ ”

گھنے کے کہنے پر مجھے بے حد شرمندگی کا احساس ہوا۔ ان کتابوں میں نصف سے زائد کے اور اق تک میں نے

پھاڑے نہیں تھے اپنی تھیلی میں کتابیں بھر کر گئے لے گیا اور میں نے چھٹکارا پانے کی سانس لی آٹھ دس دنوں بعد ایک دن شام کے وقت: "آپ کی سادھنا میں محل تو نہیں ہوا،" یہ جملہ آکر پھر سے مجھے پچھھا گیا۔ اس کے ہاتھوں میں کتابوں بھری تھیں۔ گئے نے آٹھ دس دنوں میں وہ سترہ انحصارہ سو اور اق کھاڑا لے تھے۔ یہ بالکل علاوہ اللہ ہیں کے جادوئی چداغ کے راکھشش والا معاملہ ہو گیا تھا۔ کتابیں دے دیں کہ کھاڑا لو۔

"کیا، کیسی لگیں کتابیں؟" اُسے کچھ نہ کچھ پوچھنا ضروری تھا۔ گئے ایک لفظ کہے بنا کھڑا تھا۔ مجھے لگا اُس نے میرا سوال سنائیں۔ اس لئے دوبارہ میں نے اُس سے پوچھا۔

گئے کی آنکھوں میں پانی بھرا آیا تھا۔ کوئی رو نے لگا تو مجھے بڑی بے چینی ہو جاتی ہے "کیا رے کیا ہوا؟" میں اُس سے بالکل ٹوٹ رائے بات کرنے لگا۔ اس اپنائیت سے گئے زیادہ ہی سکنے لگا۔

روتے ہوئے وہ کسی چھوٹے اسکول کے بچے کی طرح لگ رہا تھا۔ درحقیقت اب وہ میں سال کی عمر کو پار کر چکا تھا۔ لیکن میں نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا اُس میں ذرہ بھر فرق نہیں معلوم ہوا۔ آدھا پا جامد کی جگہ اب پائچا جامد، کوٹ آگیا تھا۔ ٹوپی کی نوک اب تک بالکل ولیسی ہی ناک کی سیدھی میں تھی اور آنکھوں کا تاثراب بھی یونہی برقرار تھا۔

"کیا ہوا گئے؟ رومت؟"

"مجھے معاف کیجئے"

"کتابیں پڑھنے میں وقت نہیں لگا کیا؟"

"نہیں رات دن ایک کر کے آپ کی ہدایت کے مطابق یہ کتابیں پڑھ ڈالیں۔ یہ دیکھئے۔" ایک بیاض میرے ہاتھوں میں دیتے ہوئے بولا۔

"پھر!" ایسی اس حالت میں بھی اُس کا "ہدایت" یہ لفظ سُن کر اٹھ آگیا۔ جس عمر میں پانچ پچاس مرودجہ گالیاں منہ میں ہوئی چاہئے وہاں "ہدایت" رہبری، تحریکِ زندگی، ہمت افزائی سے حاصل ہوئی تسلی، ایسی طبع شدہ الفاظ کا ذخیرہ اس کے منہ میں جمع ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی پڑھنے لاکھ خوبصورت حروفوں میں لکھی

بیاض کھولی ۔

”اس میں آپ نے دی ہوئی ہر کتاب کا جائزہ پیش کر دیا ہے“، گلنے نے ہر صفحہ پر ”جائزہ“ لکھ دیا تھا ۔

”کتاب کو پڑھنے کے لئے لگنے والا وقت رات کو ساڑھے آٹھ بجے سے ایک نجع کر پینتیس منٹ، ہم صفحات دو سو بیس،“ اس شان سے ابتدائی کالم بھرے تھے۔ اس کے آگے مصنف کا مکمل نام، پبلیشور کا نام، پتہ، قیمت ایسی ساری معلومات تھی۔ اور پھر نیچے ”جائزہ“ دیا ہوا تھا۔ ”کہانی کا پلاٹ توجہ طلب ہے کردار نگاری حب توقع نہیں۔ کہانی ممبوی، تا گپور اور لکھنؤ ان تین شہروں میں وقوع پذیر ہوتی ہے“، ایسا ہر کتاب کا خوبصورت حروف میں پختا نہ کردیا تھا۔ گلنے کا یہ مطالعہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ لفاظ تو حوض پر کافی جم جائے اُس طرح جم گئے تھے۔ آنکھ کے دیپ کیا، دلی اطمینان کیا، دل کا بڑا کمرہ کیا۔ نہیں! پیٹ صاف کرنے والی دوا کی طرح منہ کے یہ الفاظ صاف کرنے والی ایک آدھ دوا کیوں نہیں نکل آتی، اس خیال میں میں گڑ گیا۔ آخر پکھنا نہ پکھ کہنا ضروری تھا اس لئے میں نے کہا۔ ”واہ! خوب باریک بینی سے مطالعہ کر رہا ہے تو“ ۔

”میری زندگی کے ادبی میعاد کا یہ آخری باب ہے“۔

”یعنی؟“ کہیں یہ لڑکا اب جان دینے والا تو نہیں ہے ایسا مجھے ڈر لگا۔ کیوں کہ اس طرح کتاب میں کھا کر زندہ رہنے والے لڑکے کسی امیر باپ کی صرف گوری ہونے کی وجہ سے خوبصورت مانی جانے والی لڑکیوں کے عشق میں پڑ جاتے ہیں اور پھر یا تو جان دے دیتے ہیں اور ڈر پوک ہوں تو ”اینگری یونیورسٹی میں“، اس لئے بے شکنی میں ڈزاں کی پوشاک زیب تن کے پھرا کرتے ہیں اور دوسروں کے اخراجات پر کافی ہاؤس میں کافی پیتے، بھیانک نظر آنے والی، مناسب موچھوں والی لڑکیوں کے ساتھ گندی پکھروں میں اور نظموں میں فن تلاش کرتے بیٹھتے ہیں۔ لیکن گلنے اُن میں سے کہیں بھی بیٹھنے والوں میں سے نہ تھا صرف پٹاٹھ پھونٹے کی آوازُن کر اُس نے جان چھوڑ دی ہوتی۔ گلنے میرے سامنے بیٹھ کر پکھنا پکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک بار پھر سے اُسے روٹا آر رہا تھا۔ بطور مجموعی کچھ عجب سماحول بن گیا تھا۔ بالآخر گلنے نے اپناروٹا قابو میں کرتے ہوئے بولنا شروع کر دیا۔

”مجھے معاف کر دیجئے۔ اس کے بعد میں آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں دوں گا“ ۔

”یعنی؟“ میں نے اپنے حلقة احباب میں اس گھنے کا کبھی مذاق اڑایا تھا کہیں یہ بات اُس کے کافوں تک تو نہیں پہنچی؟ لیکن یہ ناممکن تھا۔ ہمارے دوست اور گھنے کا تعلق پیدا ہوا س کا امکان نہ تھا۔ ایک پولیس پر اسکیوڑ ایک موٹر کے اسپری پارٹ فروخت کرنے والا، کوئی فائر انشورنس ایجنت، تو کوئی فوج کا کپتان۔ ایسی میری کھانا اور کاویہ (شاعری) کے قریب بھول سے بھی نہ بھٹکنے والے میرے زندگی کی احباب کے درمیان صرف میں ہی ایک لکھنے کا کام کرتا تھا۔ وہ زندگی گذار رہے تھے اور میں لکھتا رہتا تھا۔ ہمارے دوستوں کی بوئے گھنے کو چکر آ جاتا۔ میں نے گھنے کو سمجھانے کی غرض سے کہا۔ ”ارے تکلیف کیسی؟“

”ویسا نہیں، تم نے بہت کچھ کیا میری خاطر، بڑے پیڑ کے نیچے ٹھنڈی چھاؤں میں کئی راگبیر آتے ہیں اُس کا بڑ کے پیڑ کو کیا علم؟“

”گھنے کے اس جملے سے گھنے“ ناریل ”پر آ گیا ہے یہ میں نے پہچان لیا۔ مجھے بڑے پیڑ سے دی ہوئی تشبیہ دیکھ کر خواہ مخواہ میری ناک کے نیچے بڑی جھانٹکنے لگی ہے ایسا مجھے محسوس ہوا اور ہنسی آگئی۔

”آپ کو میرے اس مسحور گن جملے پر ہنسی آ جانا فطری بات تھی۔ لیکن آپ کی شفقت بھری ٹھنڈی چھایا میں بیٹھنا میری تقدیر میں نہیں ہے۔ زندگی بھر!“

”ارے لیکن!“۔ مجھے اس ”زندگی“ وغیرہ الفاظ سے بے حد خوف پیدا ہوتا ہے۔ زندہ رہنے کو ”زندگی“ کا نام دینے والے اشخاص ہزار برسوں میں ایک بار پیدا ہوتے ہیں۔ گھنے نے خود کے زندہ رہنے کو ”زندگی“ کہنا خرگوش نے خود کے تالوکو ہاتھی کا گلا کہنے کے متراوِف تھا۔ اُس کے اُس زندگی سے شروع ہونے والے جملے کو نیچ میں ہی توڑ کر میں نے کہا، ارے گھنے آخر ایسا کیا ہوا؟“

”میری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو رہا ہے!“

لڑکا بالکل ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ سائنس بورڈ پیٹریٹ کا یہ لڑکا بذاتِ خود مہا بھارت کا ہیرو ہوا س طرح باب وغیرہ کہنے لگ گیا تھا۔

”کیسا باب!“

”کس طرح کہوں!“ اپنی ڈرپوک آنکھیں پاؤں کے انگوٹھے پر مرکوز کرتے ہوئے گھنے نے کہا۔

عکس

پھر مجھے یقین ہو گیا کہ، اپنے والد کے نام کا بورڈ مخفی رنگیں بنانے کی غرض سے موڑ سے اترنے والی گوری جوان لڑکی نے گٹنے کا خاتمہ کر دالا ہے۔ آج تک پڑھے ہوئے سارے نادلوں کا خلاصہ اس کے والد کے ذہن میں آگیا ہو گا اور سکھارام گٹنے کا وہیں خاتمہ ہو گیا ہو گا! آخر میں نے ہی خود اسے پوچھا۔ ”کہیں پیارو یار میں پڑ گیا ہے کیا؟“

” نہیں ! ” بیجاپور کے دربار میں شنھے شیوا جی نے سینہ تان کر بادشاہ کو جواب دیا ہواں طرح اپنی اٹھائیں انج والی چھاتی تان کراس نے کہا۔ ” آج کے دور میں بے لوث پیار کہیں بھی نہیں ملتا۔ ”

” کس نے کہا تجھ سے ؟ ”

”آپ ہی کے ”پنچھیوں کے اسکول“ ڈرامے کے ہیر و کا یہ فقرہ ہے۔!  
میں نے مسن ہی مسن میں اپنی پیشانی کو ہاتھ لگایا۔“ پنچھیوں کا اسکول کا مزاج یہ کردار یہ جملہ کہتا ہے۔ آخر  
میرے لئے بھی یہ تاگوار گزرا اور میں نے کہا۔ ”پھر کیا ہوا تجھے؟ اتنا جوان تو، اتنا مطالعہ کا دلدادہ۔۔۔۔۔  
۔۔۔۔۔ مجھ سے بھی زیادہ تیر مطالعہ اور رورہا ہے۔؟“

” کیا کروں؟ حالات ان اشکوں کا سب سے بڑا کارخانہ ہے ایسا وابستہ کہا کرتے تھے۔ ”  
” کونا میر؟ ”

"*لکا*"

وہ کوئی والبے مل جاتا تو تویرانے سلطان کی طرح اُنہاں کا کرکتا ہیں جلا کر دھواں دما کرتا۔

”ایسی کون سی مصیبت آئڑی تجھے ہے؟“

”میرے والد کی سمجھ میں میری زندگی کا مقصد نہیں آ رہا ہے۔“

میرے سامنے سکھارام گئے کا پینٹر باپ رونما ہوا۔ میں نے اسے کالا یا گورا دیکھا نہیں تھا۔ چونکہ وہ پینٹر تھا اس لئے کالا یا گورا کی کنی رنگوں والا ہو گا۔ اس لفظوں کو انچوں میں گن کر ان میں رنگ بھرنے والے شخص کے گھر میں پیدا ہوئے! اس بال برہستی کی زندگی کا نصب العین کیوں کر سمجھ میں آئے گا۔ ”مقصد حیات“ کہنے کے بعد ”کس سائز میں لکھوں صاحب؟“ کہنے والا فرد وہ۔ !

”اُنھوں نے میرا بیاہ رچانے کی گھٹیا سی سازش روپی ہے۔“ گلنے کے چھوٹے سے نیلے ہونٹ کا نپ رہے تھے۔

”ارے، پھر اس میں گھٹیا سازش کیسی؟ تجھے بیاہ نہ کرنا ہو تو منع کر دے اُنھیں!“

”یہی گزارش کرنے میں یہاں آیا تھا۔ مجھے میرا کچھ نہیں لگتا۔ زندگی کی جنگ کے بارے میں۔“ دوبارہ ”زندگی!“! گلنے اب بندھن توڑ کر بات کر رہا تھا۔

”زندگی کی لڑائی میں خون میں لٹ پت ہونے کے واقعات آئیں گے ہی۔“

”ارے، والد اچھے سے شادی طے کر رہے ہیں تو پھر تو خون میں کیوں لٹ پت ہو رہا ہے۔“

”مجھے اپنے بارے کچھ نہیں لگتا۔ میں والد صاحب کے حکم کی تعییل میں خود کو رشتہ ازدواج میں باندھ لوزگا! پر جو رام چندر یہ میرا آ درش ہیں! میں بھی والد صاحب کی خواہش کا احترام کروں گا۔“

پر بھورا میں چندر نے شادی کے بعد حکم کی تعییل کی تھی یہ تفصیل گلنے بھول گیا۔ اُسی اتنے سے جسم و جان سے پر بھو رام چندر وغیرہ لفظ سننے وقت مجھے بنسی روکی نہیں جا رہی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ پھر تیرا کیا کہنا ہے؟ میں تیرے والد صاحب سے آ کر ملوں!“

”یہ میں آپ پر چھوڑ دیتا ہوں۔ میں شادی کے لئے تیار ہوں۔“

اب البتہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ بہادر جوان جب اپنی گردان نچھا ور کرنے تیار ہے تو کیا میں جا کر دشمن کی تلوار کی دھاڑ رتیز کر آؤں؟

”میں ایک بار نہیں، دس مرتبہ شادی کے لئے تیار ہوں لیکن میں آپ کے ساتھ دھوکا بازی کرنا نہیں چاہتا،“

”میں گلنے کی آنکھوں میں دیوانے پن کی جھلک نظر آتی ہے کیا تلاش کرنے لگا۔“

”میرے ساتھ دھوکا کیسا؟“

”آپ بھولے ہوں لیکن میں نہیں بھول سکتا۔ اپنی پہلی ملاقات میں دی ہوئی دستخط میں روزانہ پڑھتا ہوں اُس میں آپ نے پیغام دیا کہ ساہبیہ کے ساتھ جڑے رہو۔!“

میں کوٹ ٹوپی پہن کر سیدھے اس کے والد سے ملنے گیا۔ ایک پرانے باڑے کے سامنے ہمارا تانگہ رکا۔

بازے کے کس تاریک کرے میں یہ ہنومان مجھے لجاتا ہے اس کا انتظار کرنے لگا۔ اتنے میں باسیں جانب کی سیرھی کے اندر ہیرے سے ایک قوی شخص اترा۔ خوب بڑا گنجائیں، کروت جیسی موچھیں، کان پر گھنے بال، پیشانی پر دوانگی والا گندھ، پیٹ کی وسعت قمیض سے جھانکتی ہوئی صاف شفاف دھوتی پہنا ہوا یہ پچاس کے لگ بھگ عمر والا قوی شخص گئے کا باب پہ جان کر میرا سینہ دھڑ کرنے لگا۔ اس کے بعد میں نے نمسکار کیا۔

گئے کے گھر کے بارے میں میرا قیاس بالکل غلط نکلا۔ پینٹنگ کا کار و بار ان کے مختلف کار و بار میں سے ایک تھا۔ اس کے والد نے، رنگ کا تو در کنار، ڈاڑھی کا برش تک ہاتھ میں پکڑا نہیں تھا۔ کیوں کہ برآمدے میں کھڑے جام سے اس نے آج ڈاڑھی نہیں کرنی ہے کہدیا۔ ایسے گھنگھور شخص کے گھر میں ادب کی جڑ کیسے پیدا ہوئی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”آئے صاحب!“ گئے کے والد نے ادھ کھلی آواز میں میرا استقبال کیا۔ ”سکھیا اندر جا کر چائے بنانے کہہ دے بل میں چوہا گھس پڑے دیسے سکھیا اندر بھاگا۔ آدھ گھنے کی ملاقات کے بعد یہ معلوم ہوا کہ پونے میں گئے کی چھ عمارتیں ہیں۔ گئے کے گھر میں یہ پھوپھی کے علاوہ کوئی خاتون نہیں یہ سمجھ میں آگیا۔ اور وہ عمر خاتون دے کے مرض سے تھکتی جا رہی تھی اس لئے گھر میں خاتون کا آنا ضروری ہے اس کا علم ہوا۔ اس چہرے والے والد نے سکھیا کی ماں اس کی عمر کے بارہویں دن انتقال کرنے کے بعد دوبارہ شادی نہیں کی۔

”سو تیلی ماں یعنی کیا ہے یہ صاحب میں اپنی ذاتی تجربے سے جانتا ہوں۔ آپ جیسے دو ان شخص کیسا تھکیا جھوٹ کیوں بولوں؟“ آج تک تین عورتیں رکھیں!“ انگلی کی سرخ انگوٹھی کی طرف دیکھتے ہوئے گئے کے والد نے کہا۔ ”آج آپ جیسے شخص کے آشیرواد کی وجہ سے یہ سب کچھ ہے۔ گئے کے باپ کی امارت اور سمجھ جیسے کا آشیرواد یہ عجب بے جوڑ تھا۔ یہ یعنی نل کے آشیرواد سے بارش لگنے جیسی بات تھی۔“ جو چاہے سو کیجھے، لیکن بچے کو شادی کے لئے راضی کروادیجھئے۔ اتنا تنومند شخص میرے سامنے پھڑا بن گیا تھا۔“ لڑکی تارے کی طرح ہے صاحب! سونگا و کصرف کا نام آپ نے سنایا ہوگا۔“ میں نے صراف کا صرف نام ہی سنائے یہ بات گئے کے باپ سے کہنے سے رُک گیا۔ بدھوار میں پانچ گھر ہیں۔ اکلوتی بیٹی۔ اچھا پڑھ لکھ لیا ہے چار پانچ کلاس تک اس لئے کنڈلی جم جاتی ہے اور سکھا کچھ پاگلوں سالئے بیٹھا ہے۔ آپ سے وعدہ کیا

ہے کہہ رہا ہے۔ ”

” نہیں نہیں ! ”

” اوپر آئیے صاحب ”

پھر چار پانچ تاریک زینے چڑھ کر ہم سکھیا کے کمرے میں گئے۔ میرے کمرے میں کتابوں کی ایک الماری تھی سکھیا کی دیواریں کتابوں کی الماریوں سے بھری پڑی تھیں اور دیوار پر سانے گرو جی کے ساتھ میرا فون تو تھا اس کے نیچے بالکل میرے لکھے حروف میں بورڈ تھا ”سماں کے ساتھ جو رہے“، نیچے میری دستخط کی طرح دستخط تھی۔

سکھیا کی شادی میں میں نے اپنی ساری کتابیں بطور ہدیہ عطا کیں۔ ہر کتاب پر نیا پیغام لکھ دیا تھا۔

” ادب کے ساتھ جو رہے رہے اور زندگی کے ساتھ بھی۔ ! ”

میرے ہاتھوں نے ” زندگی ” یہ لفظ دوبارہ لکھا نہیں سکھیا زندگی کے ساتھ جوڑا ہوا ہے یہ سال بھر کے اندر ہی معلوم ہوا۔ سکھیا کے والد بذاتِ خود چاندی کی پیالی میں پوتے کے پیڑھے لے کر آئے۔ چند سال پہلے سکھیا نے پیڑھے دیئے تھے؟ اسکے والد نے پوتے کے دیئے۔

سکھارام گئے اپنی راہ پر آگیا۔ اس کی ” زندگی ” سے سماں کی رکاوٹ نکل گئی۔ پانی بہنے لگ گیا۔

☆ ☆ ☆

(ویکتی آنی ولی)

# کھانوکر

"اور آسمان کی طرف منہ کر کے اس نے گرجدار آواز میں کہا، باپا مجھے معافی نہیں۔ باڑے پر کے لوگ اپنی توندیں بڑھا رہے ہیں، میرے کاشیا کے پاؤں لنگڑے ہو جاتے ہیں اور موگرائیکن پھولتا ہی رہتا ہے۔" (چاپھا)۔۔۔ ایسا لگتا ہے کھانوکر پر بھی کچھ بھی نہ لکھا جائے۔ ان کی کتابوں سے جو کھانوکر کے حصے میں آیا ہے اُسے ہی لیکر تہائی میں بیٹھ جاؤں۔ ان کتابوں سے اُسے ہی بولنے دیا جائے۔ اُس کی ہی سنت رہیں۔ اُس کے ان حیران گن تجربات کی گہرائی تک رسائی کے اہل ہوں یا نہیں اُسے آزمایا جائے۔ دم گھننے لگ جائے تو خود کے دل سے ہی شکست مان لی جائے۔ خاموش بیٹھا جائے۔ یہ ایک انوکھا پنجھی اس مراثی ادب میں کیا آیا، کیا گایا، کیا ناجا، کیا بھی جانا۔ جانا سابو لا کیا اور سمجھ پانے اور نہ سمجھ پانے کی سرحد پر کچھ کہتے کہتے اچانک جس انجانے آشیانے سے آیا تھا اُدھر پھر لوٹ گیا۔ اُس کے وجود کی طرح سب کچھ انوکھا۔ میری عمر کی بزرگی کی بنا ہو یا اور کسی وجہ سے کون جانے، کھانوکر سے ملاقات ہو جائے تو وہ قدرے پس و پیش کرتا، خطوط میں احترام کا پہلو برقرار رکھتا۔ اُس کا "اوہ ہیے" ناٹک پونے میں دیکھنے کے بعد میں اُسے اپنے گھر لے آیا۔ صبح کا شو تھا۔ اچانک تھیز میں ملاقات ہوئی۔ اسکوں ٹیچر تختہ سیاہ پر لکھنے کے بعد جس طرح عینک کی اپری سطح سے دیکھتے ہیں اُس طرح دیکھنے کی اُس کی عادت تھی۔ منہ حسب دستور بھر پور پان سے بھرا رنگا ہوا تھا۔ کوئی میں "مرز کیشے" کہتے ہیں ولیکی ہنا آواز اُس کے ہنسنے کا انداز تھا۔ عمر کا لحاظ رکھا جائے اُس انداز سے سامنے آیا۔ میں نے کہا۔ ناٹک ختم ہونے پر گھر چل، ناٹک ختم ہوا اور ناٹک کی خوبیوں خامیوں پر بحث کرتے ہوئے ہم گھر آئے۔ دوپہر ایک دیڑھ بجے کے وقت۔ شام کو پانچ چھ بجے تک ہم موجو گفتگو رہے۔ اور تعجب کی بات یہ

تھی کہ صرف کھانوکر ہی بول رہا تھا۔ اتنی طویل اور دل کی کچھ بات کبھی جائے اس تڑپ سے کی ہوئی با تمنی تھیں۔ اتنی ہی اس کے ساتھ میری گفتگو تھی۔

درactual ذریعہ معاش کی خاطروہ ریڈیو کی نوکری کے لئے آیا اس وقت میں بھی ریڈیو میں تھا۔ سرکاری درجات کے حساب سے میں صاحب کے زینے پر تھا۔ کھانوکر اضاف آرٹسٹ یعنی ہرن مولا منگیش پاؤ گاؤنکر کا معاون۔ یعنی ریڈیو پر ناٹک پیش کرنے آئے ہوئے لوگوں کو اسٹوڈیو میں لیجانے، انجینئر کی دل جمعی کر کے کسی ایک کی ریکارڈنگ پوری کرانے، چیک کی پیشگی رسید پر دستخط کروانے، ہر کسی کو ناٹک اچھا ہوا کہنے، وغیرہ کے طریقوں سے نینٹے کی ذمہ داری اس کی رہتی۔ وہاں بیٹھنے کے لئے اُسے کرسی تک نہیں تھی کیونکہ ہر وقت کے نہ کے ”آئے تشریف رکھئے“ کہنے کی اُس کی ڈیوٹی تھی۔ اُس زمانے میں، میں اور پاؤ گاؤنکر ایک ہی کمرے میں نیبل جمائے بیٹھے رہتے۔ کمرے میں ادباء، ڈرامہ نگار، اداکار، اداکارائیں اور دیگر آنے والوں کا تاثرا رہتا۔ گفتگو اور بحث چلتی رہتی۔ اُن میں کھانوکر نہیں رہتا تھا۔ پھر۔ تریے۔ کھانوکر یا آرتی پر بھوہ ان ناموں کو جو آگے چل کر مطلب نکل آیا وہ اُن دنوں میں نہیں تھا اور بالفرض رہتا تب بھی ریڈیو میں جہاں مردھیکر جیسے اشیش ڈائرکٹر کی شبیہ کو کوئی بھیک نہ ڈالتا تھا وہاں کھانوکر جیسا ٹیکپری اضاف آرٹسٹ کس پیڑ کی تھی؟ سرکاری نوکری میں پھر وہ چاہے ریڈیو کی ہو یا ریلوے کی، جو اپنا پر موشن رکوا سکتا ہے، تبادلہ کرو سکتا ہے، سپینڈ یا ڈسکس کر سکتا ہے صرف اس کی قدر و قیمت ہوتی ہے۔ وہاں بھی کسی نے سرکاری نوکری کے لئے نامناسب ہونے کا روپرٹ دے کر کھانوکر کی وہ نوکری گنوانے کا ثواب حاصل کر لیا۔ اس طرح کے بے شمار ثواب آگیں شلوکوں نے نیت کی طرح اس کا تعاقب کر رکھا تھا۔

خطزدہ علاقوں کے گاؤں کی حدود سے باہری افلس زدہ خاندان ”زندہ رہنے کے لیئے“ گاؤں گاؤں بھکتے رہتے ہیں۔ وینکٹیش ماڈ گوکر کی کہانی یا تاول میں، جب میں نے ”لوگ زندہ رہنے کے لئے باہر نکل پڑے“ ان الفاظ کا استعمال پہلی بار پڑھاتب سے میرے دل پر دائیٰ دردناک گھاؤ پڑ گئے ہیں وہ ایک تہذیب و تمدن، اصول و بے اصولی، نیک و بدایے خیالات کو ادھیز نے والا بھی انک جملہ ہے۔ کھانوکر کو کون سے ویسے صرف زندہ رہنے کے لئے مجبی آیا۔ پاؤ گاؤنکر، شری پ۔ ل۔ بھاگوت جیسے اس کی شبیہ کی خوبیوں کو

جانے والوں نے اُسے "زندہ رہنے" کا موقع نصیب ہواں لئے جدوجہد شروع کی۔ لیکن کوئی نہ کوئی اُسے "مارڈا لئے" کے لئے بھی انجانی جگہوں پر سدا کھڑے رہتے۔ میں پہلی بار ملا تو صرف ایسے "جینے" کی خاطر آئے ہوئے کھانوکر کو اُس کے بر تاؤ میں ایسے حالات سے دوچار انسان کی قوتِ برداشت ملتی۔ ریڈ یو کے کاری ڈور میں ایسی قوتِ برداشت سے ہاتھوں میں سرکاری کاغذات اٹھائے ٹھبلنے والا یہ شخص اندر سے کس قدر انوکھے حوصلے سے بھرا ہوا ہے اس کے دل کو اس وقت اندازہ نہ ہو سکا، خود کو اندر ہی اندر سے شرمندہ کرنے والی زندگی میں جو بھی یادیں ہوتی ہیں ان میں سے یہ ایک یاد ہے۔ ان دنوں اُس کے دل میں امید جگانے والا ایک لفظیک اُس شخص سے نہیں کہا اس کا احساس خود سے خود کو شرمندہ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

اس طرح چند ماہ بیت گئے۔ کھانوکر کاریڈیو کی نوکری سے رشتہ ٹوٹ گیا۔ پاؤ گاؤنکرو گیرہ کی دوڑ دھوپ از سر نو شروع ہو گئی۔ اُسے ممبئی یونیورسٹی میں لگا دیا۔ ایسی ہی کوئی "جینے" میں تعاون دینے والی نوکری۔ پر ان دنوں میں ہی "ستیہ کھنا" میں شائع ہونے والی اس کی کہانیوں اور شعری تخلیقات نے اپنی کیمیاء دکھانی شروع کر دی۔ اور جن کی صحبت میں راتوں پر راتیں منور کی جا سکتی تھیں ایسا یہ شخص اپنے اتنے قریب تھا اور اس کا وہ صرف جینے والے انسان کا لبادہ نظر وہ سے ہٹا کر اُس کی روشنی دیکھنے کی، اُس کے اُس ٹوٹ خاموشی سے کھینچ کر باہر نکالنے اور اسے بولنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کبھی نہ کرنے کا زخم دل کو کریدتا رہتا ہے۔ ادب میں یافتوں لطیفہ کے میدان میں نئے اور پرانے لوگوں کا ملا جلا گروپ ہوا یہ کبھی میں نے محسوس نہیں کیا۔ کئی ایک نا آشنا نئے ادیبوں کی تخلیقات پڑھنے کے بعد ان کے تعارف کا شوق مجھے میں پیدا ہوا ہے۔ ان نئے نئے ادیبوں نے بڑھتی عمر کی کالی سر پر جنتے نہ دی یہ ان کا کتنا احسان ہے۔ فن لطیفہ ایسی کالی اپنے ہلکے ہاتھوں سے دور کر کے اپنے فن کوئی امیدیں دلاتا رہتا ہے۔ ایسے وقت ہاتھ ان نئے فنکاروں کی پیٹھ پر شabaشی دینے کے لئے بے چین نہیں رہتے البتہ لمبھر کے لئے ان ہاتھوں کا اپنے ہاتھوں سے لمس چاہتے ہیں، وہ ہاتھ ہاتھ میں تھام کر "دوست" کل سے زیادہ آج تو نے کتنا زلاکر دیا مجھے، اس سے قبل میری نظر میں نہ آئے ہوئے انجانے ساز و سامان سے مجھے دھنوں بنادیا یہ کہنا ہوتا ہے۔ کبھی ایک آدھ لفظ کا اس سے پہلے کبھی نہ ظاہر کیا ہوا مطلب، کبھی اس سے پہلے نہ سُنے ہوئے سروں کے زیور، کبھی ادا کاری کی اس سے پہلے

محسوس نہ کی ہوئی گھرائی۔۔۔ ایک بالکل نئے آسمان کی کھکشاں کا یہ نذرانہ ہے۔ وند اکرند یکر جب کبھی کبھی ”لینے والا دینے والے کا ہاتھ لے لے“ کہتے ہیں اس وقت لگتا ہے، ویسے وہ مناسب طاقتو رہا تھے سنبھالنے والی بانیس ہمارے پاس نہیں ہیں تو نہ کہی!۔۔۔ وہ احساس رکھ کر دینے والے کے ہاتھ کم از کم اپنے ہاتھوں میں تو لیئے جائیں۔ (ورنہ من ہی من میں اپنے ہی ہاتھ جوڑ لیئے جائیں)

کھانو لکر کا ہاتھ ایسے متعدد بار ہاتھ میں لینا چاہیئے تھا۔ عمر کی بزرگی کئی بار خواہ مخواہ آڑے آتی ہے بمشکل تمام سال پورا ہوا۔ کھانو لکرنے اُس کا ”نکشتراچے دینے“ یہ ناول کا مجموعہ مجھے عطا کیا تھا۔ میں جانتا نہیں تھا۔ ایک روز پوسٹ سے ایک کالی آئی۔ اوپر مجتہ بھرا تھے، لکھر کر نیچے پھی۔ تریہ۔ کھانو لکر ایسی دستخط تھی۔ ۲۸ اپریل ۱۹۷۵ء یہ تاریخ تھی۔ ایک ماہ بعد ایک بار یونہی کسی وقت نیچے نیچے سے پڑھی ہوئی کو تائیں پھر سے سلسلہ دار پڑھ لی جائیں اس لئے مجموعہ کھولا۔ اندر کی جانب دوسرے صفحے پر ”پ۔ ل۔ دیش پانڈے کے لیئے“ یہ طبع شدہ تحریر تھی۔ میں سکتے میں آگیا۔ کھانو لکر کو خط لکھ کر پوچھا۔ ”بابارے مجھے یہ اعزاز کس لئے؟“ ۲۳ جون ۱۹۷۵ء کو کھانو لکر کا جواب آیا۔

اُس میں بھی آخری جملے تھے۔۔۔ اب تک خوب لکھنا ہے۔۔۔ خوب لمبی منزل پانی ہے۔۔۔ آشیرواد لیتے آگے بڑھ رہا ہوں“ (یہ اقتباس لکھتے لکھتے ایک اتفاق پر تعجب ہوا، آج ۲۳ جون ۱۹۷۶ء ٹھیک ایک سال پہلے کا خط)۔۔۔ کسی انجانی منزل رسی کے لئے کھانو لکر چل پڑا۔ دل میں بس ایک ہوکی اٹھتی ہے، وہ یہ کہ، اُس کی غیر معمولی طرز تحریر کے درشن سے متاثر ہو کر دل میں لکھ کر رکھی ہوئی پناہ میں آنے کی چشمی اُس کے ہاتھوں میں بر وقت پہنچا دینی چاہیئے تھی۔ اف! بہت دیر ہوئی!

اُس کے نائک کے بارے میں اُس سے میں نے تھوڑے غفتے سے بھی بات کی ہے ”نائک“ یہ ایک ایسا فن ہے جو اسے عظمت عطا کرنے والے ہر شخص سے ذہنی و جسمانی محنت کا مقاضی ہے۔ یہاں صرف غیر معمولی پیار کا حملہ ہب ضرورت نہیں ہو پاتا۔ محض وسیع خیالات کی طاقت کا سہارا نائک کے کام نہیں آتا۔ کیوں کہ اس کی تخلیق کو عوام کی آنکھوں سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

”ایک شوئیہ با جی راؤ“ کا شود میکھتے ہوئے میں پہلے ایک کے بعد میں بالکل مسحور ہو گیا تھا۔ وہاں سے وہ

## عکس

نائک طوفان میں پھنسے جہاز کی طرح بچکو لے کھاتے کھاتے ایکبار کنارے پر پہنچ گیا دیکھ کر مجھے بے حد دکھ پہنچا تھا۔ کھانوکر کے اکثر نائکوں کا یہی حال ہوتا۔ ناول کے ذریعے دلوں پر اثر چھوڑنے والے کھانوکر کا ”انوکھا پن“ نائکوں کے شو میں ہو بہوائی طرح پیش نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی تخلیقات میں رچی بسی غیر جسمانی ٹھوس سچائیاں اس کے ذرا موال میں ہیرو ہیرو مین کی شکل میں گوشت پوست کی بن کر بو جھل ہو جاتیں۔ اس کی رعنائی خیال یہاں ممکن نہ تھی۔ جانی پہچانی حدود کے جنگلے سے اس پار کو د جانے کا کھانوکر کا ذوق اس کے سارے ادب میں نظر آتا ہے۔ ”آسمانی دائرے سے اتری ہوئی کہکشاں کی بلکی سی روشنی ساری اشیاء پر دھندلی را کھکھل کر بھری ہوئی تھی۔“ ایسے ایک جملے میں کھانوکر سارے ما حول کی اداسی کی اپنے ناولوں میں عطا سی کر سکتا ہے۔ ناول میں اس جملے کے پاس آکر ہم چند لمحے کے لئے ڈک جاتے ہیں۔ وہ تصویر دل میں اُبھری ہوتی ہے۔ اسے سرانہے کا موقع رہتا ہے۔ ذرا مدد نگاری میں ایسا موقع نہیں آتا۔ کھانوکر نے کئی ایک نائک لکھے لیکن اس کے نائک دیکھتے ہوئے مجھے لگتا کہ کھانوکر اپنے انمول خیالات کو نائک کے تند و تلخ مزاج ! بیتال کی بھینٹ چڑھا رہا ہے۔ اُن کی بہترین تحریر کو نائک کے لئے ضروری ہوا یا دھیرج میسر نہیں اس کی تحریر کی رفتار اور تیز رفتاری نائک کی رکاوٹ بن گئی کہیں ایسا تو نہیں۔ اس کا مطلب اس نے نائک کا چوکر اختیار کر لینا چاہئے تھا ایسا بالکل نہیں ہے۔ اپنی بے باک تحریر کے بل پر اس نے نائک میں کم از کم سوار ہونا چاہئے تھا۔ ممکن ہو میری امید یہ غلط ہوں لیکن موزوں نمائش کے اثر سے دور ہوئے ہوئے اُن کے نائک دیکھتے ہوئے دل کو تکلیف ہوتی تھی۔ طوفان میں گھرے خلاصیوں کی طرح ہمارے خوبیوں بھرے اداکار رنگ بھومی پر کھانوکر کے نائک کی کشتی لئے نکل پڑے ہیں ایسا محسوس ہوتا۔ شعری تخلیقات میں اور کہانی و ناولوں میں بھوت کی طرح گردن پر بیٹھے ابتداء سے آخر تک پکڑا ہوا درخت نہ چھوڑنے والا کھانوکر اپنے نائک بیچ ہی میں چھوڑ کر نکل گیا ہوا یسا لگتا۔ بور تو بے حساب لگ جاتی لیکن پھل نہ آتے!

” انگلات اینے ” وغیرہ قسموں میں مجھے دلچسپی نہیں۔ اس طرف بغرض تفریح بھی میں نہیں گیا۔ لیکن کھانوکر کے تحریر پڑھتے ہوئے وند اکرنڈیکر کا ” می تربابا جھاٹلیا“ کی خوب یاد آتی ہے۔ کھانوکر سے

جن کا بہت قریبی تعلق انھیں بھی کھانوکرنا م کے انسان اور فنکار کھانوکر ان کا متضاد امتزاج پس وپیش میں ڈالنے والا تھا۔ کئی بار تو دلی پریشانی کا باعث بھی بن جاتا۔ عام برداشت میں منہ پھٹ پن نظر آئے اس طرح سے وہ بھی پیش آیا۔ البتہ خود کو اور اس پر منحصر کرنے کا بوجھہ ڈھونے والا کھانوکر اور زندگی کے انسانی رشتہوں سے پرے معتمات و بھیدوں سے پیچھاڑے جانے کی بنا اُن کی تلاش کرنے والا، ان میں کا وہ "انتہٹھ" ان کا جھلکرا کتنا جاندار ہو گا اس کا اندازہ اسے ہی ہو گا جسے کھانوکر کی طرح ستائے جانے کی دوڑ دھوپ برداشت کرنی پڑی ہو گی اس کی مالی حالت کی طرح ہی اس کا ذہنی دانشورانہ سفر اور تخلیقی عمل اور سیموگراف کی طرح حساس بھی، جس نے اسے سخت اذیت میں ڈال رکھا تھا۔ زندگی کا عام فہم حساب سامنے رکھ کر کھانوکر کے سمجھ میں نہ آنے والے روئے کا موازنہ کریں یہ مناسب نہیں۔

"نکشتر اچیادینا" کی پہلی نظم کا آرتی پر بحکمت ہے

"میری اس انجان کو یتا کی راہ پر مت چل پڑتا

کیونکہ وہ جن را ہوں پر چل نکلی ہے

وہ ہیں اس کی ناگ موزی طبیعت سے پیدا ہوئی ہوئیں

ٹوٹ کر رہ جاؤ گے۔"

پیٹ کی آگ کو آ ہوتی دیکھ راس سے چار جوا لکم کرنے کے بعد جو تلکرنا معلوم غار میں گھومتے رہیں ایسے بے شمار رازوں سے بھرے اپنے انترمن میں گھومنے پھرنے والا یہ شخص۔ یہ گردش بھی اصولوں نے اس کے پیچے لگادی تھی اس لئے "کوئی کلاونٹ" ایسی پوزنیں تھیں اس کی۔ یہ کہاں کا وشوہد بولنے پر مجبور کرتا ہے اس کا خود اسے ہی تعجب ہوتا ہو گا۔ اس لئے وہ کہتا ہے۔

"میں خود دیکھتا ہوں خود کی ہی کو یتا کو ایک آدھ جلتے ہوئے دیے کی طرح دور رکھر،" سچ کہا جائے تو "جلتی ہوئی دھونی کی طرح" کہیئے کیا کون جانے۔ ایسا "دیا" زندگی کے آن دیکھے پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے کہ اس کے وجود کی انسانی عظیم تجربے کا احساس خال خال ہی کسی کو ہوتا ہے۔ وہ آن دیکھے پہلو کھانوکر کی جملہ تخلیقات اور فن میں اپنا وجود ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ یہ مبہم معنی میں خوبصورت ہوتا ہے ایسا نہیں ہے۔ کبھی

کھارتو وہ مویشیوں کی ملکیت کی طرح وہ خوبصورتی کی ایسی جھلک دکھا کر جاتا ہے کہ اُس خوبصورتی کے تجربے سے ہم خوف زدہ ہو جائیں۔ کسان فصل کی حفاظت کرتا ہے پہلے پہل حاملہ رہی عورت کی طرح۔ ایسا کہتے کہتے اُس نے ایک نظم میں (آدھار) دھرتی کے حمل سے لیکر زچگی تک نومینے اتنی خوبصورتی سے پیش کئے ہیں اور آخری شعر میں تو اُس نے دم دار پچ کو ہاتھ لگایا ہے۔

”دایا کے چہرے پر جھلنے والی محنت کی طرح نوٹ کرنگھر آتی ہے کوئی کی دھار، ان دو مصروعوں میں نئے شخص کے لئے نجات جس سے ممکن نہ ہوا۔ اسی تکالیف اُسے نظر آئیں۔ اُس طرح سے دیکھنا ہی انوکھا اس لئے اس کی بانی سے ایک انجامی کویتا پھولتی گئی۔ پرانے سروں کا ایک آدھر سر امڈ پڑا ہو تو وہ اتفاقیہ۔ اس کی کہانیوں اور تادلوں میں ہر لحاظ سے انوکھے لوگ ہمیں ملتے رہے ہیں۔ ”وہ میرے اندر کا گھناؤپ انڈھیرا کونڈ پڑتا ہے۔ ایسا خود اس نے ہی کہا ہے۔ ”وہ کیسری آگ کے جوالا کی طرح برہنہ“ ہے۔ اس عجیب ”نزالے“ کی یہ ساری تخلیق عام رہن سہن میں کھانوکر کی کی راہ میں وہ آتا۔ چکوے کی طرح اُسے وہ انجامی را ہوں پر لے جاتا وہاں سے پھر کھانوکر کا عجیب چال چلن آنکھ باندھے ہوئے آدمی کی طرح ہو جاتا۔ اُس کا احترام کرنے والوں کو اُس کے دھکے لگتے۔ چتوکھانوں والے کو آرتی پر پھوکی بدھ عالگ جاتی۔ اُس کی نظم کے اس چڑیا کی طرح ”گیلری کالمجہ بھر پہلے کادھوپ کا چوکور دھونڈتے ہوئے“ وہ کھو جاتا۔ اُس کھوئے ہوئے ہوں کی اس کی وہ بے بس چوں چوں کوتا بن جاتی۔

”مطلوب چڑیا چڑیا“ لفظ مادہ

### بولے منشوں منشوں مہم سا

ان سارے ابہام پر کھانوکر نے اپنی غیر معمولی ذہانت سے دنیا بنا دالی۔ مہم، انجامات، سمجھ سے باہر، تعجب خیز ایسے اس زندگی کے انسانی واقعات نے اُسے مسحور کر دیا۔ اس سحر آمیزی سے نفع پھوٹ پڑے، کہانیاں بن گئیں۔ کہانیوں کے خیالی نگر کو کون کے ہیں یہ سچ، یوں تو نزالے نام گانو والے یہ لوگ البتہ کہانی کے آدمیوں کی طرح انوکھے۔ کہانیوں کے رہنے بیسے والوں کی نسل سے۔ اُس میں اُسے ”موت“ نامی اعلیٰ راز سے بے حد رغبت۔ کھیل جاتے جماتے یہ توڑا دالتا ہے یہ خیال قوی ہو کر غمودار ہوتا۔ اُس کی چھوٹی بڑی

کہانیاں بالآخر تھیں نہیں، بر بادی، تشدید کی آگ اور شعلے کے سمندر سے جاتی ہیں۔ یہاں پر یوں کی کہانی  
کی طرح ”اور وہ راجکمار اور راجکماری اس کے بعد بہت آرام سے بڑی مدت تک زندگی گذارنے لگے۔“  
یہ بھرت فقرہ نہیں ۔

”دیوتا نے دی ہوئی زمیں میں ہم

پناہ گزیں ہوئے، اجسام بھی اُنکے

اتنا سارا ہوتے ہوئے بھی اپنے بہت سارے ادب میں موت سے جڑی چالاکی بھری برا یوں یا اوپری  
دکھاوے کی ہمدردیوں سے اس کے ادب کو جوڑنا نامناسب ہو گا۔ ”تغیر“ بلفظ ادبی تخلیق کے سلسلے میں غیر  
ذمہ دارانہ طریقے سے استعمال کیا جاتا ہے۔ کھانو لکر پر یہ الزام اچھے اچھوں نے لگایا۔ خوبصورتی کی طرح  
تغیر کا بھی ایک سچا مطلب ہے اس کا کوئی علاج نہیں۔ عام لوگوں کو مبہم مطلب نکالنا را اس آتا ہے۔ بھی اللہ  
والے بن جائیں ایسی امید رکھنا بھی غلط ہے۔ ہم بنے بنائے جواب لیکر جیتے رہتے ہیں۔ اس میں سہولت  
رہتی ہے۔ دل میں کھوٹ نہیں رہتی ۔

مستعار ملے جسم ہمیں

پکنے والے جوڑے جیسے تیار

فکر نہ غصہ ۔۔۔ بیساکی طرح

لیتے ہیں اصولاً جائز تھواہ

کم و بیش یہ لگ بھگ ہم سمجھوں کا ذکر ہے۔ ذکر میں سکھ کی بات صرف اتنی کہ ذاتی سوچ نے بچھائی زین  
ہمیں مسلسل چھپن نہیں دیتی۔ لیکن جس کے بھی فطرت کے جان لینے کے کھیل کی تحقیق کا شوق پیدا ہو اے  
البتہ بار بار موت! گھر میں، دروازے پر، باہر ۔۔۔ نیند میں! ہر جگہ۔ اس کے بغیر چارہ نہیں۔ ایسی  
حالت میں جینے والے کا ایک تئے معنوں میں نیکی بدی کا کنارہ متاجاتا ہے۔ اس کی تحریر میں اچھے بُرے کے  
لیبل، منوخ کی ہوئی نوٹوں کی طرح کوڑی کے داموں کے بن کر رہ جاتے ہیں۔ سب کچھ امید کے خلاف  
ہو جاتا ہے ۔

---

عکس

ادب-فن کے بہترین جوابات کی قوی خواہش کی وجہ سے ہم کتنے بے شکنے بے ذہب اور اسکولوں میں کام آجائیں ایسے ہتھے کر دے ہیں اس کا احساس کھانو لکر کا ادب پڑھتے ہوئے بڑی شدّت سے ہوتا ہے۔ ایک طرح سے اسکول کالج کے مختلف درجات کو پڑھانے کی غرض سے ہی ابواب کئے جاتے ہیں۔ سمجھانا پڑھانا اس کا مطلب جواب دینا ایسا ہو جانے پر دوسرے بھی کیا کر سکتے ہیں؟ ”ہر پیش کش پر ایک ایک تیز صفحہ، سراپا گوش“۔ ایسی حالت میں اچھے فنکار کو ہی نہیں، بلکہ اس میں دلچسپی رکھنے والے کو بھی گزرنا پڑتا ہے تب کہیں یہ فنکارانہ صلاحیتوں کا احساس ہوتا ہے۔ کھانو لکر کی اس حالت سے مکمل طور پر نباہ کر لیا ایسا دعویٰ میں نہیں کرتا۔ کوئی بھی نہ کرے۔ لیکن اس کے ادبی ہم نشینی میں ایسے کئی لمحے میر آئے ہیں کہ اس وقت گلوکار کو سُننے کا موقع نصیب ہوا ایسا لگتا ہے۔ ”چانی“ تاول پڑھنے کے بعد دل میں اسی طرح کا ایک عجیب سنانا پھیل گیا تھا۔ کھانو لکر کے تاول پڑھنے کے بعد ”مال ران“ یہ لفظ محض تفصیلی نہ رہتے ہوئے ایک تجربہ ہے ایسا احساس ہوتا ہے۔ اس نے موت کا احساس دلانے کے بعد عام معنوں میں نا امیدی نہ آتے ہوئے الٹی نا امیدی کے بے شمری کا احساس ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ ”موت“، ختم کر دینے والی نہیں ایک نہ ختم ہوئے سفر کی یاد دلانے والی ہے۔ شام کے مسحور گن خوبصورتی کا جواب تلاش کرتے وقت کھانو لکر کہہ گیا ہے۔

”شام کا وقت یہ ایسا - کس شاعر کا

نام چمن کا جیسے کوئی مضر نہ

شاید ہو گا اگلے جنم کے موت کے

گیتوں میں کا

کھانوکر کی مانسی تک کتنے انوکھے بول بولا کرتی

” سایوں کے پرے ایسا ایک دلیش

جس کا بس نہ اٹا را جائے، چڑھایا جائے ॥

شہرت کے بھیس اور زبان کی سختی بہت بڑی ہوتی ہے۔ تکلیف وہ جلد جانے والا وہ بھیس اور زبان پر مجبوراً نیچائی پڑنے والی وہ زبان۔ یہ تکلیف اٹھاتے ہوئے بھی یہاں جینے میں ملے ہوئے سہاروں کو کھانو لکر مانتا تھا

” کس کا جلوس جنازہ دیکھ کر کوئی  
 کوئی بے اختیار نہ کار کرتا ہے  
 اس پر ہمیں ایک دوچے کے ساتھ  
 چپ سادھنے کا اختیار نہیں  
 سکھی۔ ساجن کے مستقبل کے جوڑے کی طرح  
 یہ زندگی بھی ایک دوسرے کی ہی ہے  
 اس جینے میں گھری ڈبکی مار آیا بوا  
 ایک آدھ کوئی سب کو پیٹ سے تھامنے والا  
 دونوں کو ہی ایک دوسرے کا سہارا ہے ۔“

اس سہارے کی خوبصورتی اس کی آنکھوں سے نکل پڑی تھی۔ تخلیق فن کے وقت اس کی حالت یہ سب کچھ میل  
 نکھانے والے کی طرح ہوتی اور اس لئے اس کا ادیب مانو کسی نے ہمیں ”اب یہ سمجھو لو“ ایسا اشارہ دیا ہے مان  
 کر ہی پڑھنا چاہیئے۔ اس طرح کا اندر سے صاف سترہ ہو کر نکلا ہوا ایک آدھ ہی مصنف ہمارے ہتھے میں آتا  
 ہے اُس کے عام برداوی کی سطح پر اس کے تخلیل کی ساری خوبیوں اور خامیوں کو بھلا کر اُس کی تخلیقات کے سامنے  
 جاتے ہوئے تھوڑا سا نرم ہو کر جایا جائے۔ موازنہ کے لئے جھانکنے والے فن سے متعلق حاصل کئے ہوئے  
 اصول و ضوابط لمحے بھر کے لئے بازو رکھ دئے جائیں۔ تبھی تو ”دور نجیدہ سروں کے پیچ خالی بہشت میں“  
 جھانکنا ممکن بن جاتا ہے۔ اس تجربے کی نجیدگی دھیان میں لینی چاہیئے۔ خود کھانوکرنے بھی کچھ تجربات کا  
 لمس لیتے ہوئے ”میں اتنا پا کیزہ نہیں“ ایسا بے بسی میں کہہ دیا ہے۔

تجربات سے یاد آیا۔ کھانوکرنے کی تحریر میں بے شمار تجربات کی، فلسفے کی، سُر اور بولوں کی دیوتاؤں کی  
 بے شمار تصویریں آسانی سے تیار ہو گئی ہیں۔ وہ ایک ”الف تا“، ”شاعر تھا پھر چاہے وہ ناٹک لکھے یا ناول  
 اس کا تصور، ہی وہ تجربات کی زبان میں کرتا تھا۔ اس لئے اس کی تصنیفات سے بے ڈھب مطلب نکالانہیں  
 جاسکتا۔ اس لئے اس کے نام کے ساتھ جیون ساز، فنون گر، سبق ساز جیسے لیبل چھپاں کرنے کی گنجائش نہیں

ہے وہ لفظوں میں جکڑا ہوا تصویر وں بھرا وجود۔ وہ تصویر بھی محض ”ہو بہو“ قابل تعریف نہیں۔ خطوط پر زخم پر جانے کی وجہ سے، ہوا کا دھنکا لگ کر لمحہ بھر میں بادلوں کا ہاتھی بن جائے اور ”ہاتھی دیکھئے“ کہنے تک ڈاڑھی والا بوا جی بن جائے ایسی شکل کا۔

یہ تصویر یہی تمثیل ہیں یا توضیح اس کی صرف دخوکے اعتبار سے تشخیص بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ صرف دخوکے زیور نہیں ہیں۔ ”جسمانی حصے ہی زیورات“ ایسی ہی یہاں زبان کی حالت ہے۔ ”کونڈوارا“ کے پر شرام تانیا کو حمل کا پانی کر ڈالنے والی بدعا سے نجات دلانے والی جڑی بوٹی دے کر وہ جوگی اُس پہاڑی راستے پر سے گھر کی طرف لوٹا دیتا ہے۔ تا تیا ب قدم راہ پر نیچا ور کر بیٹھنے کی طرح بے فکر ہو جاتا ہے اور پہاڑی راستے کے نیچے سے وہ اتنی راہ آسانی سے چھوٹ کرتا تیا کے زائلے نئے پاؤں میں سرک گئی تھی۔ ایسا کھانو لکر کہہ گز را ہے۔ یہاں اپنے خوف زدہ دل کو احساس ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے لئے بھی پاؤں میں باضابطہ سر کائی ہوئی اُٹل را ہوں کی ؎ تو کی طرح ان شیعہات کی صدائے بازگشت بھی حاصل ہوتی رہتی ہے۔ پھر تا تیا گراموفون کے چن کی طرح آگے آگے سر کنے لگ جاتے ہیں۔ گراموفون کے پلیٹ میں کندہ گیت، پلیٹ کی گردان پر بیٹھا ہوا اور پلیٹ کی گردش میں ڈوبا ہوا وہ چن کا ہاتھ، وہ کس نے گھمائی ہوئی چاہی۔۔۔ انگنت صدائے بازگشت۔ سر میں موں گیاں چلنے لگتی ہیں۔ اس کے تاؤلوں میں اندر ہیرے کی ہی کتنی تصاویر ہیں۔

”کونڈورا“ گر جاتا ہے اُس عیق بیورا کو وہ ”اماوس کی طلوع گاہ“ کہہ گیا ہے۔ رات کے وقت مٹھ کی جانب نکلے ہوئے پر شرام تا تیا کو ”جهان وہاں اندر ہیرے میں بڑے بڑے رستے سے بنی لکیریں کھینچنے جیسی نباتات نظر آرہی تھی۔ کہیں پر ”سردا اندر ہیرا“ ہے۔ کہیں ”سردا گلا اندر ہیرا“ ہے۔ کہیں اندر ہیرے کی دیوار پر بڑی گھور پڑ (گوہ) کی طرح چیلکی ہوئی تھکی ہے۔ کئی بار لگتا ہے کہ کھانو لکر نے دن سے زیادہ رات ہی دل میں بسالی ہے۔ اُس کا ”اندر ہیرا“ یعنی محض روشنی کا فقدان نہیں اُسے ”بذاتِ خود“ احساس ہے۔ رات نے اُسے صرف تاروں کا دا ان نہیں دیا، تاریکی کا بھی دیا ہے۔ اور تاریکی سے اٹوٹ رشتے والے بھوت پریت کا بھی۔

کوکن کا بچہ بھوت پریت کی کہانیاں سنتے سنتے ہی بڑا ہوتا رہتا ہے۔ یہاں کے بر گد کے درخت، پیپل کے پیڑ طرح طرح کے کردار لئے کھڑے رہتے ہیں۔

انگشت دکھ در دار گھر یلو جھگڑے کی بنا پر گھر کے چھپواڑے کے چھوٹے کنوئیں کا، کنوؤں اور تالابوں کی تہہ کو پینچی ہوئی تکی عمر کی سہاگنیں، سفید لباس میں ملبوس، بال کھلے چھوڑ کر نامکمل خواہشات کو پورا کرنے کی امید میں منڈیر کے پاس آ کر اماوس پور نیما کی نصف شب میں منڈلاتی رہتی ہیں۔ یہاں کے بھوت پریت کے لئے صرف شمسان ہی بننے کی جگہ نہیں رہتی۔ مرنے کے بعد بھی باڑے کی رکھوالی سے بری نہ ہونے والے اہم شخص کبھی ناگ بن کر تو کبھی ایسا مزندگی میں پہنی ہوئی دھوتی کو کمر میں باندھے اور ہاتھ میں عصاء لئے گشت لگاتے رہتے ہیں یہاں کے مندر میں بھی بے وقت گھنٹا بجتا ہے اور نیند ہی نیند میں دیوتا سے پہلے پیچاری کا نسکار عمل میں آتا ہے معمولی مغاد، اور انہائی اندھے عقیدے کا، اس ضمن میں بے تکا امتزاج بنہ تا ہے۔ اپنی عقلِ سلیم کے زور پر اسے کوئی توڑنا چاہے تو بیتال کھناتھ کی اصل کوئی گالیوں کی اسے قدم ہے۔ ان سارے بے حساب واقعات کو درختوں و جھاڑیوں، سمندر کی آواز، بارش کے آندھیوں کا۔۔۔ نہیں پورے فطرت کا تعادن حاصل ہے۔ شفاف چاندنی میں تک درخت پوڑ لئے کھڑے ہوتے ہیں وہ بھی جادو ٹو نے والی عورت کا۔ نباتات کی خوشبو پھیلی ہے وہ بھی بھوتوں کے وٹوے تلنے کا۔ اور سرد کے بن بھی سرسراتے ہیں جیسے دھیمی آواز میں چغلی کی جائے۔ کسی جھنجھلانے جوگی کی بخیلی کی بدعا کی طرح یہ خوبصورت نظارہ یہاں موجود ہے۔ کوئن کے انوکھے پن کے بکھرے بادلوں کے سے بیکار زیور کھانو لکرنے ذرے ذرے سے چپ لئے ہیں۔ اس کے تادلوں کا لگ بھگ ہر کردار ایسی ہی کوئی بدعا کا شکار نظر آتا ہے۔ کئی بار محسوس ہوتا ہے کہیں وہی پھر سے رونما نہیں ہوئے ہیں۔ کیلڈ و اسکوپ میں رنگ برنگے کانچ کے نکڑے ذال کر گھاتے رہیں دیے یہ سارے کردار لیکر کھانو لکر گھماتے بیٹھا ہے ایسا لگتا ہے۔ سارے پاؤں کو کہیں نہ کہیں دراڑ پڑی ہوئی، سوراخ پڑے ہوئے۔ دیوتا نے دیکھ اعمال نے چھینے ہوئے نہیں بلکہ دیوتا نے ہی چھین لیئے ہوئے۔ رات اندھیاری، اچکر، گونڈ و را، گلہری، تیز طر ار۔ بدعا سے متاثر مردوزن کی یہ کہانیاں اور ”اگر بمب باجے ڈرمو“ بولنے والے بھوتوں کی ذات کا انوکھے روپ میں ساتھ نصیب ہو یہ ایسی کہانیاں ہیں۔ ”ذھیلاڈھالا“ وجود، ”جس میں کسی بات کو ثابت نہ کرنے کی چھوٹ۔ لیکن کھانو لکر کی فکر اور تحریر کی خوبی کی وجہ سے، اس میں سے اس کے ہی لفظوں کا سہارا لے کر کہا جائے تو ”ایک وسیع خلاء کا الاپ“، سنائی دے اور اس فکری رجحان کا

احساس ہو جاتا ہے۔ اس کو داد و تحصیں دے کر پاک و صاف ہو جائیں ایسا لگنے لگتا ہے۔ فکری رجحانات کے مصنف زندگی کے طرح طرح کے بھیدوں کا سراغ لگاتے رہتے ہیں تو تبصرہ نگار اس تخلیق کے اعلیٰ وادیٰ کی اصلیت کی سطح کا۔ یہ بھی ایک منجھے ہوئے فنکار کی تخلیق کے اعادہ کی طرح ایک مخلاصہ اعادہ تنقید نگاروں میں جس طرح دوسرے، تیرے سطح کے ہوتے ہیں اس طرح قلم کاروں میں بھی، قارئین میں بھی ہوتے ہیں لیکن کھانوں کر ان سمجھوں کو چکمادے جاتا ہے۔ اس کی تخلیق کی تحریک، انداز اور تار ملاتے ہوئے سانس پھول جاتی ہے۔ اس پر ہوئے سنکاروں کی کھونج شروع ہو جاتی ہے۔ ”بچو بڑھے چلو..... فکر کا برٹ ہم اختیار کرتے ہیں۔ تمہارے بہاؤ میں ذیالات کا بڑا بھنوڑنا ہو، منجد ہو جاؤ گے“، کہنے والے ”سوامی“ اسے انتریا می درشن کب دے گا؟ ”اس تہائی کی سادھنا کہاں ہوئی؟ ایک قلمی خاکے میں سدر کا کہتے ہیں۔ مجھے کا ہار موئیم سناء ہے تم نے؟ ابھی صاحب اپنے گوونڈ راؤ جی ہار موئیم بجا تے لیکن وہ بالخصوص ہار موئیم بخار ہے ہیں ایسا کبھی محسوس نہ ہوتا۔ وہ بالکل مختلف تھے۔ ویسے ہی یہ ہم تہا و مختلف رہیں ایسے شوقیہ معاملات میں۔ ”اس کے تاول میں جگد جگد ملنے“ پاگل پنا“.....

”بابی راؤ“ کی نیل ”چافیا“ کی سندھیا، ”کالائے تسمیے نم“ کی شکو، ”ایکانا کا چانت“ کی وہ ”کھڑکی والی لڑکی“ ..... کھانوں کے لاذ لفظوں میں کہیں تو یہ ”بلطفی“ اسے مسلسل کیوں اشارہ کر رہی تھی؟ اس کی تخلیقات میں تین طرح کے نام روپ بر کرنے والے ایک ”وحشی“ ہے خوبصورتی کا بد صورتی سے بیاہ ہے۔ نظامِ قدرت کی طرح ہی زم وخت کا ساتھ جاری ہے۔ میں نے ایک مرتبہ کھانوں سے کہا ”ارے دوپاؤں کی صحت مندا چاکو تو نے نیکی کے نیچے کچل کر لو لا کیوں کر دیا؟“۔

چشمے کی کانچ کے اوپر سے دیکھتے ہوئے کھانوں نے دھرمی آواز میں کہا ”میں نے نہیں کیا۔ وہ ہو گیا“۔ اس کے کئی کرداروں کے بارے میں مجھے اس سے کچھ پوچھنا تھا۔ اب یوں لگتا ہے۔ اس نے مجھے یہی جواب دیا ہوتا: میں نے نہیں کیا ..... وہ ہو گیا ..... وہ ہو گئی ..... گاؤں والوں نے اسے کچل کر مارڈا ..... ممانی نے ہی وہ گیت رپے تھے۔ ”

”کس کے کندھے پر کس کا بوجھ“ ایسا وہ کہہ گیا تھا۔ اس کے کندھوں پر انگشت شخص خاکوں کے، موسموں کے، قرمزی بادلوں کے، تاریکی کے، سانپوں کے، مندروں کے گنبد کے، گابھارے کے، جنگلی راستوں کے بوجھ قدرت نے اس کے کندھے پر لاد دیئے تھے۔ ایک ایک بوجھ وہ کاغذ پر اتارتا جا رہا تھا مگر بوجھ بڑھتے ہی جا رہے تھا۔ بھوت پریت کی طرح وہ اتارتے جا رہا تھا۔ ”چافا“ کا وشنو کہتا ہے۔

”اب کے ہم گھوڑے بن گئے ہیں“ ہمارے منہ میں لگام ڈال دی ہے کسی نے تو لگام ..... مجھے مردھیکر کے ”جگ لگاما“ (کس کی باندھی لگام) کی چنکا دینے والی یاد آگئی۔

اسی طرح ایک گھوڑا بنا ہوا کھانو لکر تیز رفتاری سے بھاگ رہا تھا۔ اس دوڑ میں، بھی اس کے کانوں میں خلا، کا مدھم سرنسائی دے رہا تھا۔ ”ٹیوز“ نام سے اس کا ایک شخصی خاکہ ہے۔ ہار موئیم کی ٹیونگ کرنے والے شخص کا۔“ دوسروں میں بہترین سر کی شناخت کرنے والا ٹیوز۔ بھیڑ کی شور و غل اور تاریکی سے بھرے کرے میں رہتا تھا۔ آس پاس بگڑے ہوئے ہار موئیم۔ ان کے سمع خراش سردوں میں کہیں اسے سردوں کے تال میں اور سنگت اسے نظر آ رہی تھی۔ ان بگڑے سردوں کے شور و غل میں سنگیت ڈھونڈتے ڈھونڈتے اسے اپنا سارٹھیک سے جمانے کا موقع ہاتھ نہ آ سکا۔ وہ ایک کام باقی رہ ہی گیا تھا۔“

..... کھانو لکر کے ادب کے ٹوٹے ہار موئیم نے ساز کی طرح لوگوں کا اور ان کے ساتھ کھانو لکر کے جڑے رشتے ناطے کی کھونج لگ گئی ہے ایسے وقت احساس ہوتا ہے۔ لیکن وہ اتنی آسانی سے لگ گئی ایسا نہ کہا جائے۔ نہ جانے زندگی کی آخری دنوں میں اس نے اپنے یہاں کے قیام کا تجربہ، اسے حاصل ہوئے ہوئے بے مثل و انمول انفرادیت سے پیش کیا ہوتا..... لیکن اس سے پہلے ہی چھپر۔



(میر)

## ووڈ ہاؤس

۱۶، فروری ۱۹۷۵ء صبح کی گاڑی سے پونے سے مبینی جانے کے لئے نکلا تھا۔ بہہا برس سے ووڈ ہاؤس یہ میرے سفر کا ساتھی ہے۔ اُس کی کتابیں باسی ہونے کے لئے تیار نہیں۔ میرے سفر کے بیگ میں دوسری کوئی بھی کتابیں ہوں مگر ووڈ ہاؤس لازمی ہے۔ یہ میں نے لے لیا۔ اتنے میں دروازے کی خالی جگہ سے ”سکال“ داخل ہوا پہلے صفحہ پر ووڈ ہاؤس کے رحلت کی خبر۔ ایک ہاتھ میں کبھی نہ مرنے والا ووڈ ہاؤس اور دوسرے ہاتھ میں ۹۲ ویں سال میں ووڈ ہاؤس کے موت کی خبر دینے والا ”سکال“ اُس لمحے مجھے ووڈ ہاؤس کا ایک قول یاد آیا۔ ”لے اوٹارا“ یہ اُس کی بے حد چیزیں اکلوتی بیٹی فوت ہو جانے کی خبر پانے پر ۲۳ سال کا ووڈ ہاؤس کہہ گیا تھا ”آلی تھاث شی وا ز امماڑل“۔

اپنی لاڈلی ”لے اوٹارا“ اور اس کی موت یہ دو باتیں اس کے خواب میں بھی بیک وقت آئی نہ تھیں۔ ”مجھے لگا وہ امر ہے“۔ ان الفاظ میں اولاد کی دائمی جدائی سے ڈیا میں والدین کے دل پر غموم کا بوجھ پڑنے والے پہلے ناقابل برداشت گھاؤ کو تعزیتی الفاظ کے اظہار کی راہ میں تھی۔ ووڈ ہاؤس کے موت کی خبر سن کر دنیا بھر کے اُس کے قارئین نے بھی یہی کہا ہو گا کہ ارے، ہم تو سمجھتے تھے وہ امر ہے!

عمر کے ۹۰ سال پار کرنے کے بعد بھی اس کے لکھنے ہوئے ناول میں کھلکھلا کر ہنسانے کے گن موجود تھے۔ ووڈ ہاؤس لکھتے جائیں اور قارئیں ہنستے ہنستے پڑھیں یہ کچھ چند سالوں کی نہیں لگ بھگ ستر سالوں کی روایت تھی، اُس کی تحریر میں مصنف کی بڑھتی عمر کا ذرا سا بھی احتمال ہوا۔ یہ ایک بھی سطر نہیں تھی۔ کہیں احساسِ تھکن نہ تھا تقریباً ستر سالوں سے رچی یہ بازی جاری تھی۔ جس میں ووڈ ہاؤس نہ ہوا۔ یہ دنیا میں ہمیں رہنا

ہو گا یہ خیال کے بھی چھوٹیں گیا تھا۔

پیغمبرِ مسیح و مولود ہاؤس نام کا ۱۵ اکتوبر ۱۸۸۱ء کو ولادت پایا ہوا یہ انگریز اپنی تحریر کا اسلوب ذرا بھی نہ بدلتے ہوئے روزانہ اپنے نیبل کے پاس بینٹھ کر کہانی، ناول لکھتا رہتا۔ پیغمبرِ مسیح و مولید یہ اُس کا نام ذرا زبان پر چڑھنا مشکل تھا اس لئے اس کا خاندانی نام زیادہ ہر دل عزیز ہوا۔ ”پیغما کے موقع پر پادری نے ایسا نام دینے پر میں روچخ کر احتجاج کر رہا ہوں یہ کسی کے دھیان میں نہیں آیا۔“ اُس نام پر بذاتِ خود و مولود ہاؤس کی یہ شکایت ہے۔ قریبی لوگ اُسے پلم کہہ کر پکارتے تھے۔

پلم کی کہانیوں، ناولوں کے ماحول کا بدلتے سماجی حالات کے ساتھ ذرا سا بھی رشتہ نہ تھا۔ اور اُس کی اُس نے پرواد بھی نہ کی۔ اس پر تعجب کی بات یہ تھی کہ اس کی توے بیانوے سال میں لکھی ہوئی کتابوں کی فروخت دس لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ ان میں جدید مغربی تہذیب کی عکاسی کرنے والے ناولوں سا جنسی بیان نہ تھا، خون ڈکیتی نہیں تھی، خون نکل آنے تک چلنے والی لڑائی نہ تھی، گالی گلوچ نہیں تھی، بیزاری نہیں تھی، کوئی بھی سماجی مسئلہ نہیں تھا۔ سیاسی رازوں کا انکشاف نہیں تھا۔ اگر کچھ تھا تو پرانا انگلینڈ اور وقت کی دھارا کے ساتھ بہہ گیا ہوا اُس سماج کا ایک طبقہ۔ وہ انگلینڈ بھی پلم نے برسوں پہلے چھوڑ دیا تھا۔ امریکہ میں نیو یارک کے پاس وہ آکر رہائش پذیر ہو گیا تھا۔ اس کا خاندان خود اُس پر اُس سے چار سال چھوٹی اُس کی پیار کرنے والی، بے حد فکر کھنے والی ساتھی اتحل، کچھ کئے اور بلیوں پر مشتمل تھا۔ تخلیقات پر لاکھوں ڈالر ملے رہنے کی وجہ سے لانگ آنلینڈ پر ریم میں برگ نام کے مضافات میں رہائش کے لئے ایک خوبصورت چھوٹا سا بنگلہ۔ اُس پاس چند ایکڑ باغ۔ اُس میں گھنی جھاڑیاں اور ان جھاڑیوں سے گزرنے والی پکڑنڈیاں۔

پلم کی زندگی بے حد نی تھی۔ صبح جلد اٹھ کر بنگلے کی دہلیز میں آ جاتا۔ بارہ نسکار کی طرح ہاتھ پاؤں پھیلانے کی ایک ورزش بارہ مرتبہ کرتا۔ عمر کے توے سال گزر جانے کے باوجود پلم کی ورزش کے معمول میں فرق نہیں آیا۔ گھر میں بیداری آئی ہوئی نہ رہتی۔ پھر خود اپنا ٹوٹ تیار کرتا، چائے بنالیتا۔ یہ ناشتہ بڑے اطمینان سے چلتا۔ ایک آدھ مزے دار کہانی (اکثر کرٹی گا تھا) یا پسندیدہ قلم کار کی کتاب پڑھتے پڑھتے ناشتہ پورا ہوا، دوسری ضروریات سے فارغ ہوئے کہ سحرگشتی پر نکل پڑتا۔ ساتھ گھر کے کئے ہوتا ضروری تھے۔

کتے اور بلیاں یہ پام کا دائیٰ حلقة احباب۔ ایک بار صحیح کا سیر سپاٹا پورا ہوا کہ نوبجے کے قریب وہ مطالعے کے کمرے میں داخل ہو جاتا۔ کہانی ناول کے ریشے جوڑنا شروع کر دیتا۔ ان کی تخلیقات سے اس شخص نے انگنت لوگوں کو حصی آواز سے لے کر اوپھی آواز تک ہر قسم سے ہنسایا۔ صرف ہنسایا نہیں پی۔ پھی۔ ووڈہاؤس یہ لٹ لگادی۔ کسی نے انگریزی کتابیں پڑھنے والوں میں ووڈہاؤس پڑھنے والے اور ووڈہاؤس نہ پڑھنے والے ایسے دو حصے کئے تھے۔ جس میں آگیث اس معروف لیکن کسی کی تعریف کرنے میں بے حد کنجوس اور منفی یا خلاف تنقید میں سخت نقاد نہ کہا ہے ”تحوڑے بہت ووڈہاؤس پسند کرنے والے ایسے اس کے قاری اس دنیا میں ہوں یہ ممکن ہی نہیں ہو سکتا“۔ ووڈہاؤس پسند ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ الف سے تک پسند ہے۔ یا اپنے بال گندھرو کے گانے کی طرح ہے جو مکمل طور پر پسند کرنا ہوتا ہے۔

(سدھیشور شاستری فنکار کو ووڈہاؤس پسند ہے اور اس کی ساری کتابیں ان کے تختے پر موجود ہیں، یہ جب میں نے پڑھا اُس وقت ان کے لئے جو احترام میرے دل میں تھا وہ اُبل پڑا تھا) ”لت“ سے مختلف دوسرے ووڈہاؤس کے لئے لفظ ہی نہیں ہے۔ ایسے شوق سے ایسی لٹ سے جنہیں بگڑتا نہ ہو وہ اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہیں رہ سکتے ہیں۔ صرف فلاں اصول یا مدد ہب ہی میں بنی نوع کی بھلانی ہے ایسا اصرار کرنے والوں نے مصیبت نہیں مول لینی چاہیئے (وہ ایسی مصیبت میں نہیں پڑتے) ان کے ہنے کے عضو پر قدرت نے ہی نہ کھلنے والا ڈھلن بٹھایا ہوا ہوتا ہے۔ ان میں غرور کی بدبوی کی رہتی ہے اور وہ بلا وجہ بیزار ہو کر جیتے رہتے ہیں۔ انھیں دائیٰ جھونٹا پچا دشمن مطلوب رہتا ہے۔ ایسے ”دشمن“ کا سماجی خوف پیدا کرنے میں جو کامیاب ہو جاتے ہیں وہی حکم چلانے والے (حکم شاہ) بن جاتے ہیں لیکن ”مزاح“ تو دوست جوڑنے والا ہوتا ہے۔ اس لئے ایک حاکم کے تحت چلنے والی حکمرانی میں پہلا خون ہوتا ہے وہ مزاح کا ظرافت کا۔

ووڈہاؤس جیسے لوگوں کو۔۔۔ نہیں، دیوتا صفت انسان کو۔۔۔ حکمران طبقہ کے اس روئے کی سخت پیش سمنی پڑی۔ اس کی اچھوتی طبیعت اور نازک جس ظرافت اس کی زندگی میں قهر ڈھائے ایسی حالت ہو گئی۔ مہذب دنیا شرم سے اپنی گردان جھکانے پر مجبور ہو جائے ایسی حالت ہو گئی تھی۔ ایک مکمل جھوٹ انسان کو گرم سلاخ سے دئے ہوئے داغ کی طرح، کس طرح چپاں رہ جاتا ہے اور سرکاری پر چار

کے نام کے تحت چلنے والے ذہنی بُرے خیالات کا خواہ مخواہ شکار ہو کر کس طرح جینا پڑتا ہے، یہ اُسکی دل کو چھلنی کرنے والی مثال ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ان سارے انسانی درد میں اوپر ہی اوپر لطائف بانٹنے والا وہ ہاؤس اپنی مزاجیہ تحریر کے ایمان پر کیسے کھرا اُترا اُس کی حقیقت اس شخص کے سامنے احترام سے سرٹکنے پر مجبور کرنے والی ہے البتہ ہنسانے والے شخص کو کوئی محترم نہیں گردانتا۔

کبھی بھی نظر یے اور اصول کی تبلیغ یا اس کی مخالفت کی غرض سے ووڈہاؤس نے نہیں لکھا۔ زندگی کے عمیق نظر یے کی فکر نہیں کی۔ اس نے کہا تھا۔ ”میرے سامنے کسی بھی طرح کی رہبری کے اصول نہیں ہیں میں صرف جی رہا ہوں۔ لکھتے بیٹھوں تو بے مجہ ادھر ادھر دیکھتے رہنے کی ہمیں فرصت نہیں رہتی۔ ایک کے بعد ایک کتابیں لکھتے رہنا یہی میری زندگی ہے۔ کتنی آسانی سے ووڈہاؤس یہ کہہ گیا ہے۔

۱۹۰۲ء میں ووڈہاؤس نے پیشہ وارانہ قلم کاری کے میدان میں پہلا قدم رکھا اور ۱۹۳۰ء کے اختتام سے پہلے ۱۲ ڈرائے، ۳۰ مزاجیہ نگیت والی تحقیقات، سیکڑوں بھاؤ گیت، ۲۵ کہانیاں اور ۳۲ ناول لکھے تھے۔ یہ مخفی تخلیقی کمال نہیں تھا۔ اس میں سے تقریباً ہر تخلیق کامیابی کی سیر ہی پا چکی تھی۔ گود میں اور کاندھے پر اٹھائے جس طرح بچے کو کھلایا جاتا ہے اس طرح انگریزی زبان کو کھلانے والے ووڈہاؤس نے خود کی ایک الگ دنیا بسالی تھی۔ اس کی زبان اور اس کی منظر نگاری، اس کی اتنی اپنی خود کی ہے کہ اس کے ادب کا ترجمہ کسی بہترین نظم کے ترجمہ کی طرح ناممکن ہے۔ اس کے کردار ایک خاص انگریزی دور کے اور اس وقت کی تہذیب میں اس قدر رچے بے ہیں کہ اس سے انھیں الگ کرنا غلط سمجھا جائے گا۔ اس کے باوجود وہ وہ ہاؤس کے مزاح میں ایک اعتماد موجود ہے۔ انگریزی زبان سمجھنے والے دنیا بھر کی مختلف تہذیبوں میں جیئے والے لوگوں کو اس لطائف نے، افلاطونی مزاح کی تشبیہ سے، مزاجیہ مناظر سے آنکھوں سے پانی جاری ہونے تک ہنسایا۔

اس کا برٹی بوشر اور جیوز ”اسمتح“ اس نام کے ہجے بلاوجہ ”پی“ سے شروع کر کے پہلے ”پی“ کا تلفظ ادا نہیں کرتا ہے اس کی وضاحت کرنے والا اور ہمیشہ پیے ادھار دینے والے کی حلاش میں رہنے والا ”اسمتح“ لارڈ ایمسور تھا اور اس کا وہ بلونڈنگز کیسل، یگز، ملنر، انکل فریڈ، گولف کہانیوں والا وہ ماہر گولف ”معمر کن“

آنٹ اکستھا کی بے شمار پھوپیاں، مہانیاں یہ سارے لوگ اور ان کا خالق انھوں نے انگریزی ادب میں یہ ہنگامہ پیدا کر رکھا تھا۔ اس ہنگامے کا اختتام نہیں تھا اور موت سے ہی ماند پڑنے تک اس ہنگامہ نیز کے ہاتھوں کی مشعل بجھی نہیں تھی۔ ایک نقاد نے اس کی تخلیقات کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا ہے۔ ووڈہاؤس کی ذہانت تھکنے کو تیار نہیں لیکن نقاد تو توصیفی الفاظ ڈھونڈنا لئے نکلتے تھکنے لگے ہیں۔

لکھنے سے اسے بے حد انس تھا۔ لکھنا یعنی نیبل کے سامنے بیٹھ کر ہاتھ سے کی ہوئی تحریر۔ املا دے کر محرر سے لکھوانا لینا اس سے نہ ہو سکا۔ ایک بار اس تھکل نے شیپ ریکارڈر جیسا کوئی آله لا کر اس کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کی تھی۔ ووڈہاؤس کہتا ہے ”میں“، ”تحینک یوجیوز“ اس ناول کا مضمون اس آئے پر کہنے لگا اور پچھلے دیر بعد وہ مضمون سننے لگا تو میرا مجھ سے ہی سنا نہیں جا رہا تھا۔ بہت تھکان پیدا کرنے والا لگ رہا تھا۔ اور میری آواز کسی پادری جیسی ہے اس کا اس لمحے تک خیال تک نہیں تھا۔ وہ اس طرح کی آواز یادہ آله اُن میں سے کوئی ایک میری ناگ کھینچ رہا تھا۔ خیر! دوسرے دن میں نے وہ نکتا آله فروخت کرڈا۔ ”سامنے شترنج کی بساط جما کر خود اپنے ساتھ ہی کھیلے بیٹھیں ویسا یہ اس کے لکھنے کا پروگرام رہتا۔ خود ہی مشکل چال چلیں اور خود ہی اس سے مزے دار چھٹکارا حاصل کریں۔ اس لکھنے کے شوق کے بارے میں خود اس نے کہا ہے۔

”لکھنے کا کچھ اور ہی لطف ہے۔ آپ فطرتا اہل قلم ہیں تو آپ پیسوں کے لئے، شہرت کیلئے، یا زیادہ کیوں کہیں شائع کر کے شہرت پائیں اس لئے لکھنے بیٹھتے ہیں ایسا مجھے نہیں لگتا۔ مجھے تو بار بار لکھنے کی اور وہ لکھا ہوا گھس پوچھ کر صاف شفاف کرنے کا بے حد شوق ہے۔ ایک بار کاغذ پر اتار دیا۔ پھر وہ کتنا ہی بے ذہب کیوں نہ ہو..... کہ مجھے لگتا ہے کہ اپنی جھوٹی میں کچھ کم جمع ہو گیا..... اے اے ملن تو کہتا ہے کہ کتابیں شائع تک نہ کریں وہ لکھی جائیں۔ اس کی خوبصورتی جلد طبع کی جائے مصنف کو پڑھنے کے لئے۔“

”یعنی دوسرا اور کیا ہے؟ تخلیق ادب میں سچ مجھ میں ایک کھیل ہوتا چاہیے۔ اس کھیل کا مزہ محسوس کیا جانا چاہیے۔ ووڈہاؤس یہ ادب کا کھلاڑی تھا۔ اس کا خود کا میدان تھا۔ اس کی خود کی ٹیکم تھی۔ اس کی کہانیاں ناول یعنی یعنی ان سارے کھلاڑیوں کی زندگی کا ”کھوکھو“ آئیا پاشیا، لنگڑی، دوڑھوپ آنکھ مچھولی،..... وغیرہ مختلف اقسام! اور ووڈہاؤس ان کھیلوں کا آنکھوں دیکھا حال بتانے والا مزاجیہ کا مینٹریز

یہ سب اس کا حلقة احباب تھا۔ یہاں کوئی کھلنا نک نہیں کسی کے دل میں پاپ نہیں۔ یہاں کی ہار جیت کھیل کی طرح۔ یہاں کا پھنسنا غلطی کرتا، تاش کی بازی کے پھنسنے پھسانے جیسا۔ یہاں کا پیار، اس پیار میں حائل ہونے والے لوگ، اس میں سرما رکھو شیاں حاصل کرنے والے ناٹک، انھیں جیلی کی طرح تھرھرانے پر مجبور کرنے والی وہ آتیا بائی (آنٹی)، مصائب سے نجات دلانے کے لئے وشنو کی طرح ایتادہ وہ جیوز یہ ایک انوکھا مزے دار ناٹک۔

ناٹک ہی کہنا چاہیئے، کیونکہ اس کے کرداروں کا ہنگامہ اور دوڑ دھوپ کسی اشیج پر کی جا رہی ہوا یہی رہتی ہے۔ ناول کے کردار بھی ناٹک کے کرداروں کی طرح ہمیشہ حرکت میں رکھنے چاہیے یہ دوڑ ہاؤس کا ہی خیال تھا۔ اس نے ان کرداروں کو سُست ہونے نہیں دیا ایک ایک سین یعنی ایک لڑکن سے دوسری لڑکن تک لیجانے کا پروگرام دوڑ ہاؤس یہ ناٹک کا پروڈیوسر ڈائریکٹر (ڈور تھامنے والا) اور ناظر بھی۔ اپنا ہیر و نئے تازعہ میں پھنس گیا کہ پہلے اسے ہی خوشی ہوتی۔ پھر اس کا ڈائرکٹر (ڈور تھامنے والا) خوش ہو کر اس کی فضیحت کا تذکرہ مزے دار لفظوں میں کرنے کے لئے بیقرار رہتا۔ ایک آدھا یہی مناسب تشبیہ نکل آتی کہ وہ سو جھنے پر مجھے لگتا ہے خود دوڑ ہاؤس گد گدی ہونے کی طرح ہستا ہوگا۔ صفحے صفحے پر ایسی کتنی مزاحیہ تشبیہیں، عمدہ شعروں (نظم) کی طرح بالکل بدلتے نہ جاسکیں ایسے الفاظ کا انتخاب۔ ایک بات البتہ یقینی کہ دوڑ ہاؤس سے اسکی انگریزی میں ہی لطف اندوڑ ہوا (ہونے کا تجربہ کیا) جا سکتا ہے۔ ترجیح میں اس کے اسلوب پر گرفت نہیں آتی۔ طبلے کی تھاپ پر ”دھا“، یعنی وہاں ”دھا“، ہی ہونا چاہیے ”دھن“، نہیں چل سکتا، ویسا ہی دوڑ ہاؤس کے لٹائن کا ہے۔ ترجمہ یوں دیکھیں تو یہ ایک سہولت ہے۔ دوڑ ہاؤس پڑھتے ہوئے اس کا احساس بدرا جھے اتم ہوتا ہے۔ اس کا وہ ”جیوز“ یہ ”بٹلر“ ہے اب ”بٹلر“ یہ لفظ جاپانی ”گیشا“ یادور کیوں جائیں ”بھٹجی بُوا“ یا ”بٹھلے“ کی طرح ہی ناقابل ترجمہ ہے۔

اس کی انگریزی زبان کو حسب خواہش کھینے لگانے کا چونچلا پنڈت۔ غیر از پنڈت سمجھوں کو تھا۔ ۱۹۳۹ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی نے دوڑ ہاؤس کو انگریزی ادب کی خدمات کے لئے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ اس سے قبل مارک ٹوین اس مزاح نگار کو اعزازی ڈاکٹریٹ دی گئی تھی۔ اپنے یہاں کی

یونیورسٹیوں سے البتہ مزاح نگار کو اعزازی ڈاکٹریٹ عطا کرنا یہ عام طور پر کسی کو بھی بہترین تندوری چکن تیار کرتا ہے اس لئے "شال اور ناریل" دینے جتنی ناممکن حدودی بات ہے۔

**۱۹۳۹ء میں انگلینڈ میں ووڈ ہاؤس کے مزاح کو اتنے بڑے پیمانے پر اعزاز حاصل ہوا اور سال دو سال ابھی بیتے بھی نہ تھے کہ زمانہ جنگ کا غذہ ارہٹن کہہ کر احتجاج شروع ہوا۔ جس کے قارئیں میں میں رڈ پارڈ، کلپنگ، آگا تھا کر تھی، جارج آرڈیل، مالکم مگر ز جیسے انگریزی ادب کے عظیم قلم کا رہتھے۔ بلیر بیلاک جیسے انگریزی مصنف نے جس کی "فی الوقت بقیہ حیات مصنفوں میں بلاشبہ سب سے بہترین مصنف" کہہ کر بی بی سی نیتسائین کی، اُسی ووڈ ہاؤس پر اُسی بی بی سی پر پانچویں درجے کا، غدہ ارہٹن، لارڈ ہابا ایسی بدتا می شروع ہو گئی۔ خاص کر اس وقت کے ہر لش وزیر نشر و اشاعت ڈف کو پرنے تو ذاتی بیر ہوالی کردار کشی کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ البتہ برلن ریڈ یو پرنٹر کی گئیں جن تقاریر کی پنا پر اُسے غدہ ارہٹن قرار دیا گیا تھا اُن تقریروں سے متعلق کہ وہ تقریریں کیا تھیں، جانکاری حاصل کرنے کی کے بھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ یعنی ایک طرف ووڈ ہاؤس نازی جرمی کے قید خانے میں صعبو تیں جھیل رہا تھا اور اُسکے مادرہ طن میں اُس کے خلاف اُس کے جرم نوازی کے لئے زہر اگلا جارہا تھا۔ یہ بے گناہ و معصوم شخص غدہ اری کرے گا ہی کیوں یہ خیال اُسے مور د الزام ہٹرانے والوں کے من میں لمحہ بھر کے لئے نہ آئے اسے کردار کشی کی بے ربط تشویہ کی فتح قرار دینا چاہیئے۔**

پرائی اس بھی انک حالت میں ووڈ ہاؤس نے لیکن صبر و ضبط پر کسی قسم کا اثر نہ لاتے ہوئے اس نے جو ہمت و استقلال کا مظاہرہ عوامی سطح پر کر دکھایا وہ دیکھنے کے بعد ظاہری طور پر مزاح تقسیم کرنے والا یہ شخص کتنا قد آؤ اور کتنا گھرا ہے اُس کا ثبوت مل جاتا ہے۔ الگ الگ جیلوں میں اور نظر قید جگہوں کے کمپ میں لیجا کر محصور کئے ہوئے ووڈ ہاؤس کی ظرافت لمحہ بھر کے لئے تک اُسے چھوڑ کر نہیں گئی۔ وہ زمانہ نظر قید کے تجربات کی مزاجیہ ڈائری لکھ رہا تھا۔ مزاجیہ ناول کے چیخ و خم تیار کر رہا تھا اُسے سلیمانیہ رہا تھا۔

فاقہ جاری تھا۔ کڑا کے کی سردی میں سانچھ کی عمر کو پہنچ ہوئے ووڈ ہاؤس کو فرش پر سوتا پڑتا تھا، بیت الخلاء صاف کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا اور "مزاجیہ تخلیق" یہی ایک اپنے بس کی بات ہے ایسا سمجھنے والا پالم او گوں کو ہمانے

والے صفحات پر صفحات لکھتے جا رہا تھا۔ ہم ”میرا دھرم“ کی ڈینگیں ہانکتے ہیں۔ ووڈھاؤس اُسے نبھاتا تھا۔  
مزاجیہ تخلیق یہ اُس کا ”میرا مذہب“ تھا۔

دوسری جگہ عظیم کے وقت ووڈھاؤس فرانس کے پلاز کے قریب سمندر کے کنارے والے ”ل  
ٹلکے“ نام کے چھوٹے سے گاؤں میں رہائش پذیر تھا۔ ۱۹۲۰ء کے ماہ مئی میں نازی جرمنی والوں نے ”لٹل  
پر قبضہ کر لیا اس گاؤں میں جتنے انگریز تھے۔ انھیں خود کے ہی گھر میں نظر قید کر دیا گیا تھا۔ ہفتے میں ایک بار  
جرمن کمانڈنٹ کے دفتر میں حاضری دینا پڑی تھی۔ ایسی صورت حال ہونے کے باوجود اس کے خلاف پرو  
پیگنڈا کرنے والوں نے ”ووڈھاؤس کو پکڑنے کے لئے نازی فوجی آئے اس وقت اس کے گھر میں پارٹی  
چل رہی تھی۔“ وغیرہ جھوٹی خبریں پھیلادی تھیں۔ نازی فوجی زبردستی لوگوں کے گھر میں گھس کر ان کے حمام  
میں غسل کرتے، کھاتا بر باد کرتے، اس حقیقت کے برخلاف، نازی فوجیوں کو اپنے غسل خانے میں نہانے کا  
انتظام کر کے ووڈھاؤس انھیں پارٹی میں مدعو کرتا تھا، ایسا پر چار بھی کیا جاتا تھا۔ ووڈھاؤس کہتا تھا۔ ”ان حرام  
خوروں کو اپنے گندے جسم دھونے“ ”میرے با تھروم میں آؤ“ ایسی دعوت دونگا کیا؟ میں نے انھیں ڈانٹ کر  
بھی دیکھا۔ کیا دم اور کیا کچھ! دوبارہ آئے تو اور بھی فوجی ساتھ لے کر گھس گئے!“ فرانس نے اپنی خود  
پر دگی لکھ کر دی تھی۔ باہری دنیا کی خبریں سننے والوں پر پابندی تھی۔ انگریزی اخبار آنے نہیں  
دیا جاتا تھا۔ فاسٹ حکومت میں، خبروں کا بلیک آؤٹ، یہ ایک موثر ہتھیار ہوا کرتا تھا۔ اور گوولیں جیسا  
مخالف اشتہار کرنے والوں کے کا استادوں کا استادر بننے کے بعد اس کے پروپیگنڈا میں کیا ظاہر کیا جاتا اور کیا  
پوشیدہ رکھا جاتا تھا اس کا تصور کرنا بھی ناممکن تھا۔

ووڈھاؤس حسب معمول اس جرمن کمانڈر کے دفتر میں ۲۰ جولائی کو حاضری دینے گیا لیکن فضا الگ لگی۔  
”لٹل“ میں رہائش پذیر سارے پر دیسی مردوں کو نظر قید کرنے کا حکم صادر کیا گیا تھا۔ ”ضرورت کی جو چیزیں  
ہونگی وہ بیگ میں بھرلو اور فوراً تھانے پر حاضر ہو جاؤ“ ایسا حکم آیا تھا۔ وہاں سے انھیں جرمنی کے کانسٹریشن  
کمپ میں لے جانے والے تھے۔ ووڈھاؤس کے لفظوں میں کہیں تو ”نظر قید کا پیشگی تجربہ نہیں تھا۔ اس لئے  
بیگ میں کیا کیا رکھا جاتا ہے اس کا علم نہ تھا۔ اس لئے پاپ، تمبکو، پینسلیں، بیاضیں، بوٹ، داڑھی کا

سامان، ٹھنڈی کے لئے سویٹر، ٹینس کی نظموں کا مجموعہ، مکمل شیکسپر کا سیٹ، اور آدھا پونڈ چائے کی چتی۔ اتنا سامان بھر دیا۔ اتنے میں اتحل نے اس بیگ میں کولڈ میلن چاپ اور چاکلیٹ سلیپ گھسا دیا۔ رُل بھر لوئی لوایسا کہہ رہی تھی۔ لیکن دھوپ میں لوئی پکھل جانے کا تھوڑا سا خدشہ تھا اس لئے وہ ارادہ ترک کر دیا۔“ اتحل سے الوداع کہہ کر گھر چھوڑ دیا۔ یہاں سے اسے سال بھر خوب پریشانی ہوئی۔ ساٹھ سال سے جنگی قیدیوں کو قید میں نہ رکھا جائے اس قانون کے تحت اس کا چھٹکارا ہوا۔ اس نظر قید کے زمانے پر ایک امریکی براؤ کا سٹنگ کمپنی نے اسے تقریں کرنے پر لگادیا۔ وہ یہ ”بلن براؤ کاست“ جرمنوں نے دھوکے سے اس کا غلط استعمال کیا اور انگریز اپنی حس ظرافت رہنے کر گئے۔ دراصل بھڑکنا چاہیئے تھا، جرم و والوں کو لیکن زمانہ جنگ میں ریڈ یو سے ووڈہاؤس کیسے بولا؟ بس! یہ ایک سبب لیکروہ کیا بولا وہ دھیان میں نہ لاتے ہوئے اس پر کچھ پھیکنے کا سرکاری پروپیگنڈا شروع ہوا۔ اسے فاسٹوں کا بغل بچہ کہا جانے لگا۔

جنگ بند ہو گئی۔ جرم ہار گیا۔ سب کے دماغ ٹھنڈے ہوئے اور ۱۹۵۳ء سال میں ووڈہاؤس نے ان تقریروں کو اپنے دوست ناؤں اینڈ کوشائی کرنے کی اجازت دی۔ اس دوست کو ووڈہاؤس نے عمر بھر بڑے مزیدار خط لکھے تاؤں اینڈ یہ بذاتِ خود اچھا قلم کار۔ اسے وہ سارے خط سنپھال کر رکھے اور شائع کئے۔ سی ان اوکیسی نام کے مصنف نے ووڈہاؤس کو انگریزی ادب کی ”پرفارمنگ فلی“..... یعنی ”بازی گیری کرنے والی ملکھی۔ مختصر یہ کہ ”تماشہ بین“ کہا ہے۔ اس خطوط کے مجموعہ کا نام وہی رکھا۔ میں تماثی گیر ہوں ووڈہاؤس نے خود تسلیم کیا اور نہ جانے وہ جو خامی جان کر کیا ہو گا اسے خوبی کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس ہنسانے والے شخص کو دوسرے کسی اعزاز کی خواہش نہ تھی۔ بھر پور کچھ اچھا لگا یا تھا لیکن پلم کے ناؤں کے برابر شائع ہو رہے تھے۔ برٹی اوستر بار بار حرکت کر رہا تھا۔ اس کا وہ مستحکم (اور ثابت قدم) جیزوں اطمینان سے مالکوں کو ان سے چھڑا لاتا تھا اور اتنے ہی اطمینان و سکون سے الگ تھلک ہو جاتا تھا۔ لوگ پڑھتے تھے، ہنتے تھے۔

جنگ ختم ہو کر پانچ سال بیت جانے کے بعد اس کی کتابوں پر بھر پور توصیی تبرے میں ”ووڈہاؤس کی مزاح نگاری کا نعم البدل نہیں“، ایسی سفارش کی جا رہی تھی۔ لیکن فوراً دوسری جنگِ عظیم

میں نازیوں نے اُسے پکڑ کر آپ سائی لے شین جیل سے برش جرمیوں سے پناہ مانگیں اس غرض سے کئے گئے پر چار کے بُرے خواب جیسے دن اور وہ بُرے خواب جیسی یادیں اب ختم ہو چکی ہیں۔ ”یدم جوی ہوئی تھی ہی۔

”استیہ میو جینٹے“ کی بہترین مثال ہے۔ پلم نے یہ تبصرہ پڑھا۔ اس پر اس کا رِ عمل اس کے مزاجیہ مزاج پر بچتے والا ہے۔ ”بارہ سال قبل میں نے جب میں سانحہ سال کا کنکر تھا اس وقت اس بیان کا زخم ہوا ہوتا۔ اب ستر سال کی عمر گذر جانے کے بعد ایسے دار کے زخم نہیں پڑتے۔ اب اس گھریوال کی تک کسی وقت بند ہو گئی کہا نہیں جا سکتا۔ ایسے وقت کسی بھی چیز کا دکھ سن جانا دیوانہ پن لگتا ہے..... لوگ میرے بارے میں اخباروں میں چاہے جو بھی لکھیں۔ جب تک وہ میرے نام کے سپیلینگ غلط نہیں کرتے تب تک اس کا مجھے احساس نہیں ہوتا۔ ایسا کہتے ہیں کسی نے کہا تھا۔ میرا حال اس شخص جیسا ہے۔ مقصد یہ کہ، میرے متعلق یہ غلط نہیں اگر لوگوں کے اذے اذے پر چلنے والی ہوتا ”برلن براؤ کاست“ کو شہرت ملی اس میں بھی کچھ نقصان ہونے والا نہیں ہے۔“

اور مزے کی بات یہ ہے کہ برلن براؤ کاست یعنی جن جرمیوں نے پلم کو نظر قید کر رکھا تھا اُس کا دراصل بھر پور مذاق ہے۔ فاقہ کشی اور تنکالیف پروہ طنزیہ تقریریں یعنی ایک مثال ہے۔ جرمیوں میں اس کی چیزیں سمجھیں میں آئے اتنی مزاجیہ جس نہیں تھی یہ ووڈہاؤس کی خوش قسمتی۔ ورنہ انھوں نے کب کا اُسے سولی پر چڑھا دیا ہوتا لیکن تعجب ہوتا ہے تو وہ انگریزوں کے جس مزاج کے ختم ہو جانے کا۔ ہٹلر نے اس حد تک تو انگریزوں پر فتح حاصل کی تھی کہنا چاہیے۔ اُن کا ایک مزاج نگار دشمن کے ملک میں رہ کر دشمنوں کا بے حد مذاق اڑا رہا تھا اور وہ محض اس لئے کہ دشمن کے ریڈ یو پرسے وہ تقریریں نشر ہو یہیں اسے دشمن کا پرچار قرار دیا گیا تھا۔ ووڈہاؤس کی ان انگریزی تقریروں کا ترجمہ کرنا یقیناً مشکل ہے۔ اس کے باوجود ایسی اس حالت میں اس نے جس مزاج کو سنجا لے رکھا تھا اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے یہ بے مثل ہے۔ اُن تقریروں کی ابتداء ہی کتنی دلچسپ ہے۔

”میرے سامعین کو میرے بولنے میں اگر تھوڑا بہت جاہلانہ انداز ملے تو وہ برتی بوسٹر کے لفظوں میں کہیں تو فوراً واضح کرنے کی ضرورت رہنے والی جیسی ہے۔ میں ابھی ابھی جرمی میں ۳۹ ہفتتوں کے مختلف جیلوں کی سیر کر کے نکلا ہوں۔ مطلب یہ دوسرا شخص پہلے جیسا نہیں رہا“ یہاں سے آگے پلم نے اپنی پانچ تقریروں میں

زمانہ قید و بند کی صعوبتوں کو مزاح کے رنگ میں رنگ دیا ہے جو من کمانڈ کے دفتر (تحانے) سے اس کا گھر تین چار کلو میٹر دور تھا۔ بیک لینے کے لئے جو من افسروں نے اُسے پانچ منٹ کی مہلت دیکر فوجی گازی میں بٹھا کر گھر تک لے گئے۔ ووڈھاؤس کہتا ہے۔

"موڑ گاڑی میں لیجانے کی وجہ سے مجھے لگا جو من لوگ مجھ سے خوش ہوں گے۔ گھر پہنچ کر منہڈے پانی کا شاور با تھلیا جائے۔ پائپ سُلگا کر بیک میں رکھنے کی چیزوں پر غور کیا جائے ایسا خیال تھا۔ البتہ میرے ساتھ آئے ہوئے جو من فوجی نے "جلدی سمینے" کہکر چلاتے ہی میرے والے پر پانی پھر گیا۔ اُس کے خیال میں پانچ منٹ کافی تھے۔ بالآخر دس منٹوں پر سمجھوتا ہوا ۔۔۔۔۔ میری مستقبل میں کردار نگاری کرنے والے اسے نوٹ کر لیں۔ اس سے آگے کچھ دن نظر قید میں گذارنے ہیں یہ خیال آتے ہی پہلی بات جو میرے ذہن میں آئی وہ یہ کہ اب کرس کر شکسپیر کی جملہ تخلیقات پڑھ لی جائیں۔ پچھلے چالیس برسوں سے میں مکمل شکسپیر پڑھنے کی پلانگ کر رہا ہوں۔ تین سال پہلے اسی مقصد سے آکسفورڈ ایڈیشن بھی خرید لیا تھا لیکن "ہیملیٹ" اور "میک بیٹھ" کا مطالعہ کر کے "ہیمزی ڈائیٹھ" حصہ اول، دوم اور سوم کا مواد ذہن نشین کر سکوں اس سے پہلے آگا تھا کھرتی کی امید و بیم (suspence) کہانیوں کے کسی نہ کسی بات کی طرف دھیان مبذول ہو جاتا اور پڑھنے کا کام آگے ڈھکلنا پڑتا۔ یہ نظر قید کی حالت چند سالوں کے لئے تھی یا ہفتوں کے لئے تھی اس کا کوئی علم نہ تھا لیکن بطور مجموعی حالت البتہ مکمل شکسپیر کی طرف نشاندہی کر رہی تھی اس لئے وہ بیک میں گھس پڑا۔ اس گز بڑی میں ووڈھاؤس ایک ہی چیز بیک میں رکھنا بھول گیا تھا وہ تھا اس کا پاسپورٹ۔ بیک بھر کر ہو گئی تو پھر سے ایک بار پہم کو اس جو من کمانڈر کے سامنے کھڑا کر دیا (اس کمانڈر کی ایک آنکھ کا نجخ کی بھائی ہوئی تھی۔ اُس آنکھ کا ووڈھاؤس کو بہت ڈر لگتا تھا ایسا اُس نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے) وہاں بھر پور وقت بے حس و حرکت ہو جانے کے بعد ووڈھاؤس کا سفر شروع ہو گیا۔

اس نظر قید کے زمانے میں کئے گئے سفر میں بڑی تپش رہتی ہے۔ ہمیں کہاں لئے جا رہے ہیں کچھ پتہ نہیں چلتا۔۔۔ یعنی ہم پڑوی گاؤں میں آئے یا آدھایور پالٹ دیا اس کا اتنے پتہ نہیں چلتا۔۔۔۔ ہمیں لیل نام کے شہر میں لوں نام کے مضافات میں لے گئے تھے۔ ستر میلوں کا فاصلہ۔ پر راستے میں نظر قیدوں کے

دوسرے ”ارکانِ منظمه“ کو بھی ساتھ لینا ہوتا ہے اس لئے اتنا راستہ پار کرنے میں سات گھنٹے لگے۔“

اُس بس میں ان ٹنکے گاؤں کے جو دوسرے انگریز پکڑ کر گھادائے گئے تھے وہ سب اُس کی پہچان کے تھے۔ آگے کیا پروں کر رکھا گیا ہے اس کی کے بھی خبر نہ تھی۔ نظر قید ہونے کا یہ ہم سب کا پہلا تجربہ۔ لیکن ہر کوئی اپنا اپنا دماغ لڑا کر اندازہ کر رہا تھا۔ ہمارا آل جی یعنی انسانی شکل میں سورج کی کرن! نا امیدی کا اندر ہیرا اُسے نامنظور۔ ہم سب کو گرمی کی تعطیل میں رہنے کی سہولت، بڑے لوگ با غصوں میں بڑے آنکن کے ساتھ بنگلے تغیر کرتے ہیں؛ ویسے بنگلے میں کی جائیگی ایس کی پیش گوئی تھی۔ بنگلہ؟ میں برابر۔ بنگلہ آل جی یعنی انگلے برآمدے میں پیلے پھولوں کی بیلیں وغیرہ چڑھائی ہوتی ہیں اس طرح کے۔۔۔ بیلوں کا یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔۔۔ ہو بھی سکتی ہیں یا نہ بھی ہوں۔ لیکن آنکن کیا ریوں والے بنگلے میں ہو گا یہ یقینی بات ہے۔ پھر ہمیں پیر دل پر چھوڑ دیں گے۔ دن بھر بن جنگل میں گھومنے کی اجازت رہیگی۔ مجھے لگتا ہے ہنگ ذال کر مچھلیاں پکڑنے بھی دیں گے۔ کچھ دیر کے لئے بس کا ماحول خوشگوار بن گیا۔ مچھلی پکڑنے کا کوئی خاص شوق نہ رکھنے والے کہنے لگے، ہم اپنے دھوپ میں گھوم پھر آئیں گے۔

کچھ دیر بعد دھیان آیا کہ آل جی کو نظر قید کی الف ب معلوم نہیں۔ بنگلے ہی میں رکھنا ہے تو پھر ہمارے بنگلے کیا بُرے تھے؟ خواہ مخواہ ہمارے خود کے بنگلے سے اٹھا کر لیجا کر دوسروں کے بنگلوں میں ایکدم رہائش دی جائے اس کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے بعد لیکن ضرور ہم ٹھہر تے گئے۔ آشادا دکی جگہ بے چینی نے لیتے ہوئے اور لیل گاؤں کو موز لے کر ایک بھی ایک عمارت کے سامنے جس وقت ہماری بس کھڑی ہو گئی اُس وقت ہمارے جوش خروش کے پارے نے صفر سے نچلا نیا درجہ حاصل کیا تھا۔ وہ عمارت یعنی مقامی جیل یا علاقائی قید خانہ کے علاوہ اور دوسری کوئی نہیں ہو گی یہ واضح ہو چکا تھا۔ ایک فریض مستقل سپاہی نے دروازے کھولے اور ہم اندر داخل ہوئے۔

اب اس تقریر میں کہاں سے وطن سے غد اری آئی! لیکن برٹش وزیر نشر و اشاعت کو وہ نظر آئی۔ برلن ریڈ یو پر کی گئی ایسی دس دس منٹوں کی پانچ تقریریں یعنی کل پچاس منٹ۔ انسان کو نظر قید کر کے اس کی آزادی چھین تو سکو گے لیکن ان صعوبتوں کا مذاق اڑانے کی اس کی قوت کیونکر چھین سکو گے؟ ووڈ ہاؤس نے قید و بند

کا حال جس طرح بیان کیا ہے اس کا لب لباب تو انوکھا ہے۔ وودہاؤس کہتا ہے۔ ”جنھوں نے اب تک قید و بند کی صعوبتیں نہیں جھیلیں انھیں بھلائی کی خاطر ایک بات کہنی ہے۔ خاص طور پر یہ کہ ایسے اداروں میں داخلہ حاصل کرنا مشکل کام نہیں ہے۔ کسی بڑے ہوٹل میں کمرہ ریزرو کر کے رکھنے جیسا ہی ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا کہ دروازے کے پاس شعبہ استقبالیہ میں پھولوں کے گلے وغیرہ نہیں رہتے۔ خود کی بیگ خود ہی اٹھانی پڑتی ہے۔ اور خدمت گار کو ٹپ دینے کی ضرورت نہیں رہتی۔

بچپن سے پاک بے عیب زندگی گذارنے کی وجہ سے، جیل کا اندر ورنی حصہ صرف سینما میں دیکھا ہوا تھا۔ اتنے میں میری نظر شعبہ استقبالیہ میں بیٹھے ایک افسر سے مکرانی۔ اور مجھے افسوس ہوا۔ زندگی میں کبھی ایسا لمحہ آتا ہے جب ہماری نظر کسی تآشا شخص کی طرف جاتی ہے اور ہمیں محسوس ہوتا ہے۔ وہ!۔ دوست مل گیا، یہ لمحہ اس قسم کا نہ تھا۔ ”شیطان کا آئندہ“، والے سینما جیسا وہ شخص مجھے دیکھ کر اپنی موچھوں پر تاؤ دے رہا تھا۔ لیکن قلم کار کی نسل ایک جھٹکے میں مایوس نہیں ہوتی۔ من میں یوں ہی ایک دھندا لاساختیاں رونما ہو رہا تھا۔۔۔ ہمیں مہمان نوازی کے لئے بلانے والا ہمارا یہ میز بان میرا نام سنتے ہی ایکدم ”أُمی مائیے وودہاؤس!“۔۔۔ اس نمبر سے۔۔۔ ازے۔۔۔ میر تر۔۔۔ ایسا کچھ بھی بڑا بڑا تا انٹھ کھڑا ہوتا۔ رات سونے کے لئے چاہے تو میرا پنگ لے لو کہے گا، ”ٹھیک، کیا بتاؤں صاحب“، میں آپ کا بے حد چاہنے والا ہوں۔۔۔ ہماری بچی کے لئے آٹو گراف دیں گے کیا؟۔۔۔ ایسا کچھ کہے گا۔

البتہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس نے ایک بار موچھوں پر تاؤ دیا۔ ایک بڑے سے رجڑ میں میرا نام لکھ دیا۔ وڈہارس،۔۔۔ گناہ اس کالم میں ’انگلش‘ ایسا درج کر دیا۔

قریب موجود پا ہیوں کو ”اے کوٹھری میں لیجا کر ڈال دو“، ایسا حکم دے دیا۔ وہ کوٹھری میں آل جیز بار کا آل جی (بنگلے میں رکھنے کہنے والا) اور ہمارے گاؤں والا سلس اور ہر دل عزیز پیانو ٹیووز و لیم کا میل ایسے تینوں کو ملا کر دی گئی تھی۔ باقی وقت کیا ہو گا بھگوان جانے لیکن زمانہ جنگ میں ہر کوٹھری میں تین لوگوں کو رکھتے تھے۔ کوٹھری کا رقمہ ۱۲ × ۸ فٹ۔ سینما کی کوٹھریوں میں رہتے ہیں ویسی سلاخیں وغیرہ نہیں تھیں۔ ایک ہی بڑا لو ہے کا دروازہ اس میں کھانے کی تھاں سر کانے کے لئے جگہ اور اندر کے قیدی سلامت ہیں یا نہیں یہ

دیکھنے کے لئے باہر کے پھرہ دار کے لیئے دروازے پر باہر سے ایک ڈھکن لگا ہوا سوراخ۔ اُس کوٹھری میں صرف ایک چار پائی اور اس پر بچھوتا۔ اُس ایک دیوار کی اوپری جانب ایک کھڑکی تھی۔ دوسری دیوار کے پاس ایک چھوٹا سا نیبل۔ اُس سے ہی زنجیر سے باندھی ہوئی تین ساڑھے تین باشت اوپنجی کری۔ کونے میں تل تھا اُس کے نیچے رکابی جتنا واش میں۔ لکڑی کا ایک شیلف اور دیوار میں ایک لکڑی کی کھوٹی۔۔۔ مختصر یہ کہ مکمل زیب و زینت ماذر ان اشائیل کی۔ چوتا گائی ہوئی دیواروں پر جو تصاویر تھیں وہ اُس کوٹھری میں رہنے والے فرنچ قیدیوں کی نکالی ہوئی تھیں۔ یہ سمجھ میں آتا تھا انہوں نے پینسل سے واضح انداز میں نکالی ہوئی تصویروں سے ان فرنچ قیدیوں کی فنِ مصوری سے متعلق اعلیٰ معیاری سوچ نہ تھی واضح ہوتا تھا۔۔۔ چاروں طرف وہ اُس طرح کی تصویریں ہوئے کی وجہ سے ”پیرس والی رنگیلا رسول“ جیسی کتاب کے صفحات کے نیچے پھنسنے ہوئے ہیں ایسا اثر ہوتا۔

ہم تینوں میں کارٹ میل عمر میں بڑا۔ اُسے ہم نے چار پائی دی اور ہم زمین پر دراز ہو گئے۔ پھر کی زمین پر سونے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ لیکن دن بھر بلند ہمتی کے بعد آنکھ لگ جانے میں دریبیں لگی۔ نیند آنے سے پہلے کا سمجھے ایک ہی خیال یاد آتا ہے۔ ڈھلتی عمر میں شریف انسان پر ایسا سانحہ گزرتا بھیا کہ ہے یہ ضرور۔ لیکن اس میں بھی ہونہ ہو لطف آتا تھا اور اپنے حصے میں کل کیا آنے والا ہے اس کا انتظار کرتا رہتا۔۔۔

اس قید و بند کے کھانے پینے کی تکالیف کا ذکر و وہ باؤس بڑے ہی مزے سے کرتا ہے اور وہ مزے سے کیا ہے اس لئے ووڈ باؤس اُس زمانہ جس میں بہت مزے کی زندگی گزار رہا تھا ایسی اُلٹی شہرت کرنے کا موقع اُسکے مخالفین کے ہاتھ لگ گیا اس طرح فاقہ کرنے والے شخص نے ”جیل میں ہم نے ٹھنڈا ناشتہ کھایا“، کہا ہو اُس کے مخالفین نے انہیں جیل میں کلفی ملائی، فرنچ کے دہی بڑے دئے جاتے ہیں ایسی تشبیر کرنے جیسا ہے قید کے زمانے میں ان تینوں کو تین پیالے سوپ اور چھوٹے تین پاؤ ملتے تھے۔ ووڈ باؤس کہتا ہے ”سوپ ٹھیک تھے۔ اُس کے ساتھ کس طرح نباہ کیا جا سکتا تھا۔ پہلا نکڑا کھانے پر جولڈت ملتی تھی وہ سچ مج ویسی ہی تھی اُس کا سمجھنا بھی ممکن نہ تھا۔ نیبل کے لکڑی کے نکڑے اڑنے لگتے۔ لیکن اندازہ دوسرا نکڑا لینے سے پہلے ختم ہو جاتی۔ پھری پنا پاؤ کس طرح کا ناجائے! نکڑا نکڑا کتر اجائے تو پھر میری کوٹھری کے ساتھی کے دانت

اُن کے لڑکپن میں ہی بیکار ہوئے تھے۔ ہاں! اگر اس نیبل پر پاؤ پنکا جائے تو ہمشکلات میں راہ ضرور نکل آتی ہے میرے پاس پاؤ توڑنے کی اجتماعی ذمہ داری آگئی (لکڑی توڑنے کی طرح) اور مجھے لگتا ہے میں نے وہ تسلی بخش طریقے سے انجام دی۔ کچھ بھی کیوں نہ ہو میں اس چیز کے حصے کر سکتا ہوں۔ اس کا طریقہ یہ ہے گردن کازاویہ قائمہ بنایا جائے اور دانتوں کے اوپری صاف پر یہ سخت کام سونپ دیا جائے۔

ایک بار وہ اس طرح شل امرت سوپ ابالنے والے باورچی کی اور ووڈہاؤس کی اس قید خانے میں ملاقات ہوئی۔ ووڈہاؤس نے ڈائری میں لکھا ہے۔

”آج طباخ سے ملاقات ہوئی۔ سوپ کے لئے میں نے اُسے مبارک باد دی۔ سوپ کم پڑتا ہے، ایسی قید یوں نے شکایت کی کرنے کی وجہ سے اُس کے پیشہ درانہ غرور کو ٹھیس پہنچی تھی۔ ”مجھے کیا پانی ملا کر سوپ پرو بنے نہیں آتا تھا؟۔ لیکن وہ میرے فن سے بُرا سلوک کرنے جیسا ہوتا“، باورچی جی میں نے کہا درست ہے۔ ہمارے پیشے میں بھی وہی ہے۔ کتنا یعنی کتنا۔ اُسے پھلا کر تاول بنائیے۔ لطف ہی چلا جائیگا۔

اس کوٹھری سے نظر قید یوں کو کھلی ہوا، تفریح اور روزش کی غرض سے صبح ساڑھے آٹھ بجے باہر نکالے اور چاروں طرف اوپنجی دیوار اور آسمان کی جانب تھوڑا بہت کھلا ہو، ایسے حصار میں لیجا کر آدھا گھنٹہ کھڑا کرتے۔ وہ حصار کلکتہ کا بلیک ہول دیکھے ہوئے اور اس کو بے حساب سراہنے والے آرکیٹ نے رچا ہوگا۔ یقیناً ووڈہاؤس نے کوٹھری میں اٹھائے جانے والے سارے مصائب کا اس نے مذاق اڑایا ہے۔ جرمنوں کے قبضے میں اُن فرشق قید خانوں کی کوٹھریوں کی گندگی کا ذکر کرتے ہوئے ووڈہاؤس کہتا ہے۔

ہمارے ۲۳۴ نمبر کے کمرے کی گندگی کیسے مضبوط قدا اور چوڑے کانڈھوں والے زیر ترتیب جوانوں جیسی تھی ہمیں اُس گندگی سے انس ہو گیا۔ فخر ہونے لگا۔ دوسری گندگی کے مقابلے میں اُس کی طاقت اور درجہ ان خوبیوں کی برتری کی بابت ہم دوسرے قید یوں کے ساتھ شرط لگانے لگے اور جس وقت ہمارے کمرے میں داخل ہوا اور گندگی کی بدبوکی وجہ سے فوراً چیچپے ہٹ گیا اُس وقت تو ہمیں ذاتی طور پر اعزاز بخشنا گیا ہے ایسا محسوس ہوا اُس حصار کی آدھ گھنٹے کی کھلی ہوا وغیرہ چھوڑ دی جائے تو اس کوٹھری میں ان تینوں کو ان کے باقی ماندہ ساڑھے تھیس گھنٹے پتائے پڑتے۔ اس تجربے کا بھی ووڈہاؤس مزاجیہ انداز میں حساب پیش کرتا ہے۔

”مکمل شیکسپر کی وجہ سے میرا تو ٹھیک تھا لیکن بارچانے والے آل جی کے ہاتھوں کے پاس کاک ٹیل بنانے کے لئے داروں نہیں تھی اور کائل کے پاس ٹیونگ کرنے کے لئے پیانو نہیں تھا۔ باقی آس پاس پیانونہ ہونے والے ٹیوز کا حال طبی مشورے کی بنا پر شاکاہاری (سینزی والے کھانے) خوراک پر رکھے ہوئے شیر جیسی ہی کہنا ہوگا۔ کچھ دن اُس قید خانے میں گزارنے کے بعد ایک دن کمانڈر آیا اور بولا۔ ”تمہارے کاغذات کی جانچ ہو جانے کے بعد، یہاں سے ہلا دیا جائے گا اس لئے تیار ہو۔“

جو ساٹھ سے زائد عمر کے ہوں گے ان کو رہا کر کے گھر بھیج دیا جانے والا تھا۔ ٹیل کا مریل اور ان کی عمر کے دوسرے لوگوں نے دوسری قطار بنالی۔ میری عمر پونے انسٹھ سال ہونے کے ناطے میں بھی اُس طرف کھک گیا۔ لیکن مجھے ”پچھے ہو“ کر دیا۔ پونے انسٹھ وغیرہ اچھا ہے لیکن جتنا اچھا ہونا چاہئے اتنا نہیں ہے۔ اس طرح مجھے سمجھا دیا گیا۔

دوسرے دن گیارہ بجے سوپ پلا کر سارے قیدیوں کو ایک دین (گاڑی) میں گھسایا گیا اور ایک ریلوے اسٹیشن پر لے آئے۔ ووڈ ہاؤس کہتا ہے۔ ”بہاں کی دوڑ دھوپ اور گڑ برد یکھ کر گاڑی ساڑھے گیارہ بجے چھٹے گی۔ یہی اندازہ کیا ہوتا کسی نے۔ پر دیسا کچھ بھی نہیں تھا۔ ہمارا یہ کمانڈر جوان بہت ہی محظا ط معلوم ہوا مجھے لگتا ہے کسی وقت اس کی گاری چھوٹ گئی ہوگی اور اس واقعے کا اس کے دل پر اثر ہو کر اُس کی گانٹھ پڑ گئی ہوگی۔ صبح ۲۰۔۱۱ کو اُس نے ہمیں اسٹیشن پر پہنچا دیا اور گاڑی رات کو آٹھ بجے روانہ ہوئی۔ ہمیں پہچانے والا سارجنٹ اول جانے پر اُس میں اور کمانڈر صاحب میں جو بحث ہوئی ہوگی اُس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

”کیوں گاڑی اچھی طرح پکڑنے ملی تا!“ کمانڈر

”ہاں صاحب! آٹھ گھنٹے اور بیس منٹوں پر۔“ سارجنٹ

باپ رے تھوڑے میں ہی مل گئی۔ اس سے آگے اتنے عین وقت جا کر نہیں چلی گا۔“

صحیح صرف پیالہ بھر سوپ پلا کر قیدیوں کو اسٹیشن پر آٹھ آٹھ گھنٹے رکھراتے رکھنے والے اُس پاپی کمانڈر کی کتنے مزے سے نہیں اڑاتا ہے۔ اُس جیل سے دوبارہ ان قیدیوں کی منتقلی ہوئی۔ ووڈ ہاؤس کہتا ہے۔

”اُس قید خانے کو الوداع کہتے وقت میری آنکھوں میں آنسو وغیرہ نہیں آئے لیکن دارڈرنے ہماری دین کا

دروازہ بند کر کے پھر ”ملیں گے“ کہا وہ البتہ مجھے کچھ زیادتی والا ہی لگا۔

”ہاؤٹو“ سے شروع ہونے والی امریکی بہت ساری کتابیں ہیں۔ ”ہاؤٹوون فرینڈس“ --- ”ہاؤٹو بی اے مل اوڑز“۔ ایسی جھٹ پٹ خوشی دینے والی کتابیں۔ ووڈہاؤس نے اپنی تقریروں کو ”مکمل علم نہ ہوتے ہوئے بھی فری وقت میں کب طرح مقید ہوا جائے؟“ ایسا نام رکھا ہے۔ اس قید خانے کے بعد ان چوالیں قیدیوں کا سفر بالکل مویشیوں والے ڈبے میں ہوا۔ اس بھیڑ کی دھمکا والی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے ووڈہاؤس کہتا ہے۔ ”کم عمر میں بیڑی وغیرہ پینے کی عادت پڑ جانے کی وجہ سے بڑھنا رُک گیا ہو ایسے گھوڑے کے بچوں جیسے بمشکل تمام آٹھ گھوڑے سا سکیں ایسی جگہ میں چالیں لوگ ٹھوس دئے جائیں تو وہ چوہی جائیں گے۔“ ہم پچاس تھے۔ رات میں ذرا پاؤں پسارتا چاہیں تو دوسرے مسافروں کو لات لگ جاتی۔ اے بھی ایسا کچھ لگے تو ہمیں بھی وہیں جھیلنا پڑتا۔ ڈبے کی ٹھلیخنوں پر سوراخ تھے اس میں بے برف جیسی ٹھنڈی ہوا ہماری نالگوں کو گھیرے رہتی۔ اوپر کی چھت سے آنے والی ویسی ہی ہوا ہمارے سر کے پاس کھلتی رہتی۔ ہم بھی چالیں اور پچاس سالوں سے زائد عمر کے تھے لیکن کے بھی نمونیا نہیں ہوا۔ گھنٹے نہیں پکڑے۔ پینچھے نہیں پکڑی۔ کچھ بھی نہیں۔ مجھے لگتا ہے قید و بند والوں کی فکر کرنے والا اپٹیشن پر میشور ہو گا۔“

بالآخر یا ترہ بیلچیم کے لیج گاؤں میں آئی اور نازی فوجی نے ان لوگوں کو ایک پہاڑی قلعہ پر بھگاتے لے گئے اور وہاں کے یہ کس میں بند کر دیا.....“ وہاں کا ماحول تہوار شروع ہونے سے پہلے ہوتا ہے دیسا تھا۔ پارٹی میں مہمان حضرات وقت سے پہلے پہنچ جانے پر جو بچل مچ جاتی ہے اس طرح کا منظر تھا۔ بالخصوص کھانے کا۔ شاید کسی بھلکڑ شاعر پر اس کی ذمہ داری سونپ دی گئی ہوگی اور قیدیوں کو کھانے کی ضرورت رہتی ہے وہ بھول گیا ہو گا۔

چجچ اتحادی واٹیاں لگتی ہیں نہیں کیا؟ کیوں جی؟ سیدھے ابلتے ہنڈے میں منہ ڈال کر سوپ پی جاؤ نہیں جنے جیسا نہیں ہو گا۔ نہیں کیا؟ ایسا بھی اس نے کہہ دیا ہو گا..... آخر کار دماغ چلا کر ہم نے وہ مسئلہ حل کر دیا۔

دماغ لڑا کر مسئلہ حل کر دیا یعنی کیا کیا؟ اس بیریکس کے پچھواڑے پرانے ڈبوں کا، بوتلوں کا، کیتليوں کا، اور موڑتیل کے ڈبوں کا۔ بیجیم فوجیوں نے چھوڑا ہوا انبار لگا ہوا تھا۔ وہ کھنگال کر ان قیدیوں نے اپنے پیالوں کا انتظام کیا۔ ووڈھاؤس کے حصے میں موڑتیل کا چھوننا ذبہ آیا تھا۔ اس وجہ سے میرے سوپ کو دوسروں کو نہ ملی ہوئی ایک لذت آئی تھی۔

آن بیریکس میں بے حد گندگی تھی۔ قیدیوں کو ہی صاف کرتا پڑی۔ وہاں کے سند اس تو ایک خاص بات تھی۔ اس کے علاوہ روزانہ تین تین بار یارڈ میں آٹھ سو قیدیوں کی گنتی کرنے کے لئے انھیں گھنٹے گھنٹے کھڑا کرتے۔ پانچ پانچ کی قطار میں بناتے۔ کبھی صحیح سے لگ نہ پاتیں۔ ہر بار مختلف گنتی نکل آتی۔ کار پول صاحب دوبارہ گناہ شروع کر دیتے ”بطور مجموعی“ میں پانچ بار گن لیا جاتا۔..... قیدی سینڈی پول، اس گنتی پر یڈ کے دوران ہم پانچ قطار میں ساتویں اور آٹھویں نمبر پر کھڑے تھے اس وقت بولا۔ ”جنگ کے خاتمے پر میرے پاس اگر بھر پور پیسے جمع ہوئے تو میں ایک جرمن فوجی خرید کر باغ میں کھڑا کرنے والا ہوں اور دن میں چھ بار اسے گن کر نکالنے والا ہوں۔

مختصر یہ کہ گھنٹوں یا آٹھ سو قیدی کھڑے ہیں اور کار پول، وارڈ را اور سار جنٹ گنتے جا رہے ہیں ایک بار تو آٹھ لوگ کم گننے میں آئے۔ پھر ان کی دوڑ دھوپ شروع (جرمن سار جنٹ نے اتنے میں کسی نے صف چھوڑ دی اس لئے اسے جرمن زبان میں گالی دی۔ فریچ ذولسان نے ان گالیوں کا فریچ میں ترجمہ کیا) آخر سکھوں کو دوبارہ بیریکس میں گھسا کر کھولی گنتی کی اس کے باوجود آٹھ کم نکلے۔ سارے فوجی افسروں کی مند ہو گئے۔ آخر فریچ ذولسان کو یاد آیا۔ اس نے کہا ”صاحب، اپتال میں داخل قیدیوں کا کیا؟..... افسران اپتال کی طرف دوڑے۔ وہاں دراز ہوئے قیدیوں کی تعداد آٹھ ہو گئی۔ حساب کتاب بیٹھ گیا۔ ایک بار قیدی کہہ دیا کہ آدمی کا صرف ”نمبر“ بن جاتا ہے ووڈھاؤس ایک غیر معمولی ادیب تھا۔ کسی کے بارے میں دشمنی کا تصور نہ رکھتے ہوئے، کے بھی انسانوں سے اٹھانے کی کوشش نہ کرتے ہوئے اپنے دلچسپ مزاج سے اس نے لاکھوں کو خوشی عطا کی تھی۔ لیکن قید ہو جانے کے بعد اس کا بھی ”قیدی غبر سات سو چھانوے“ ہو گیا۔

جمن افرود نے اسے لج کے بیریکس میں سند اس صاف کرنے کا کام دیا۔ ریڈ یو پر کی اس کی تقریب میں اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے کسی کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہی مزاح کا اسلوب ”لچ کے بیریکس کی صفائی کرنے ہمیں بہت دن لگے۔ مجھے کسی کی بے عزمی نہیں کرنی ہے۔ لیکن ایک بات کہتا ہوں۔ آپ نے جب تک بیکھیم فوجیوں نے استعمال کئے ہوئے سند اس صاف کرنے میں ہاتھ نہیں لگایا، اس وقت تک میں کہوں گا کہ آپ نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔۔۔ چند سالوں بعد مجھے اگر کسی نے آکر پوچھا، کہ کیوں جی، جگہ عظیم میں تم نے کیا کیا؟ تو میں کہوں گا۔ ”لچ کے بیریکس میں سند اس صاف کئے؟“ اور مجھے سوال پوچھنے والا شخص فوراً مجھے لگا ہی تھا، ایسا کہہ یہ نامکن نہیں۔ کیوں کہ ہوا موافق ہوتا بھی میری جانب وہ خوبصورت تھا۔ کسی نے کہا ہے تا۔۔۔ آپ کا نج کا گلدان کتنی بار بھی توڑ ڈالیں پھر بھی اس سے جبوی ہوئی گلب کی خوبصورتی کیے الگ ہوگی؟

رہ رہ کر مجھے تعجب ہوتا ہے کہ ووڈ ہاؤس اس برلن براؤ کا سٹ میں جرمنوں کی مسلسل نوپی اچھال رہا ہے یہ کس کے بھی ذہن میں کیوں نہیں آیا! اپنے پسندیدہ مصنف کو جبراڈمن نے سند اس صاف کرنے لگائے یہ سن کر چڑا آجائی چاہیے تھی۔ لیکن ہوا بالکل مختلف۔ بی بی سی پر سے ولیم کائز نام کے مصنف نے تو ”ہتلر کی توصیف کرنے کی منظوری پر ووڈ ہاؤس نے اپنی رہائی کروائی“۔ یہاں تک زہر اگل دیا۔ اس کی اس تنقید میں ووڈ ہاؤس نے کیا کہا اس بارے میں ایک لفظ تک نہیں آیا۔ اس وجہ سے لوگوں نے سمجھا ”ووڈ ہاؤس نازی پر چار کی تقریریں کر رہا ہے، یہی ہوا۔ بی بی سی کے گورنگ باڈی نے تک یہ غلط ہے اس لئے اس دروغ گوئی کو جگہ نہ دی جائے ایسا فیصلہ کیا۔ لیکن وزیر نشر و اشاعت نے ان پرحتی برست کر کائز کا ووڈ ہاؤس مخالف پر چار جاری رکھا۔

لچ سے ووڈ ہاؤس اور دیگر ہمیشہ کے سات سو نینا نوے قیدیوں کی منتقلی ویو نام کے ایک قلعہ پر کے کانسٹریشن کمپ میں ہوئی۔ جان لیواٹھنڈی۔ بستر لحاف نہیں۔

ووڈ ہاؤس کہتا ہے۔ ”داخل ہونے کے دروازے سے اندر جانے پر سیدھی جانب ایک خوبصورت بیت الخلاء تھا،“ ان قیدیوں کے کمپ کے اہم منتظمین کو ایک ہی بات معلوم تھی۔ ”کوئی بھی قیدی کچھ بھی کرتا ہو تو اسے وہ

کرنے سے منع کر دیا جائے۔“ پاؤ کا نکڑا، کافی ہو گا ایسا شہبہ پیدا کرنے والا ایک مشروب، سو کھی بزریوں کو ابال کرتیا رکیا ہوا سوپ۔ اس بھکری کا بیان بھی ووڈ ہاؤس بڑے مزے سے کرتا ہے۔

”اس نامکمل خوراک کو مکمل خوراک کا نام دے کر ہم نے مختلف تجربے شروع کئے۔ میری دیا سلائی کی تیلیوں کو چبانے سے عقیدت ہو گئی۔ اگلے دانتوں سے چبا چبا کر اس کا نوالہ بن گیا کہ اُسے نگل دیتا۔ پہیٹ بھرتا نہیں تھا لیکن بھوک کا سہارا کہنے مُرانہ تھا۔۔۔ کبھی کبھار کینٹین کھل جائے تو ہمیں آدھا نچ جوڑی، آدھا نچ لمبی اور پاؤ انج موٹی ”چیز“ مل جاتی۔ اس کے کھانے کا طریقہ اس طرح تھا۔ شکسپیر کی شعری تخلیق یا ٹینس کی نظموں کا ایک اچھا ساصفحہ لیا جائے اُس میں اُسے لپیٹ دیا جائے۔ لذت کے لئے دیا سلائی کی ڈبیکی چار تیلیاں اس میں ملائی جائیں۔۔۔ یہ پکوان کھانے میں لذیذ لگتا ہے۔

ویسے قلع کے قیام کے دوران اٹھائی جانے والی مصیبتوں کا احوال ووڈ ہاؤس اس طرح مزاجیہ انداز سے بیان کر رہا تھا۔ وہاں سے بھی پھر شماں سائلیشیا کے ٹوست نام کے گاؤں میں لیجا کرو ہاں ایک عمارت میں بھر دیا۔ وہاں ڈھونگی پا گلوں کا اسپتال تھا۔ تین دن اور تین راتیں ایک جگہ بینٹھ کر ریل گاڑی کا سفر۔ اس دوران آدھا ساتھ، آدھا پاؤ اور تھوڑا سوپ یہ میزبانی۔ اس قید کے دوران ووڈ ہاؤس کا وزن چالیس پونڈ کم ہو گیا۔ احاطے میں تو سخت پھرا۔ سامنے اور پیچھے سنگین سنجلے ہوئے تازی فوجی۔ ان حالات میں اس پٹھے نے ایک مزاجیہ ناول لکھ دیا۔ یہاں ووڈ ہاؤس کا قیام بیالیں دن رہا۔ قیدیوں کے درمیان روزانہ ایک امید افزای فواہ گشت کرتی۔ وہ کبھی بھی چج نہ نکلتی۔ ووڈ ہاؤس البتہ ”این ایپل اے ڈے کپس ڈڈا کڑا اوے“ کی طرز پر کہتا۔

”اے رو مرائے ڈے کپس ڈڈا پریشن اوے۔“

روزانہ کی نئی افواہ من کی تھکان دور کر دیتی تھی۔ قیدیوں میں پروفیسر تھے، گلوکار موسیقار تھے، ماہر لسانیات تھے، مقرر تھے۔ کبھی کبھار ایک دوسروں کے ساتھ گھل مل جانے کے لمحے میر آتے تھے۔ نصیبوں میں آیا بھگلتا ہے کہہ کر سارے جی رہے تھے۔ ان کی قوت ارادی مضبوط تھی۔ ووڈ ہاؤس کہتا ہے۔ ”اتا خوش مزانج اجتماع اس سے پہلے مجھے کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ ان کے ساتھ میرا بھائی جیسا پیار ہو گیا تھا۔“ زمانہ

قید میں حاصل کئے ہوئے سارے مصائب بھرے تجربات کا ذکر مزاج میں لپیٹ کر پہنچانے والے ووڈھاؤس کی ان تقریروں کا انجام لیکن دل دہلانے والا ہے۔ آخر تک اُس کا تصور یہ تھا کہ تقاریر پر امریکی کمپنی نے امریکہ کے سامعین کے لئے نشر کی ہیں۔ اس کا انگلینڈ میں اتنا متصادر عمل ہو رہا ہے یہ بات اس کے خوابوں میں تک نہ تھی قید کے زمانے میں ریڈ یوکہاں سے نہیں گے؟ ان تقریروں کی وجہ سے اپنے امریکہ کے سیکڑوں قارئین کو میں زندہ ہوں اور مقید ہوتے بھی ساری مصیبتوں سے اڑ کر بچا ہوں یہ معلوم ہو یہی خواہش تھی۔ اس لئے برٹش شہری قیدی نمبر ۹۶۷ اس روں سے آخر میں وہ کہتا ہے ”میں مقید تھا اُس وقت جن امریکی رحمل شہریوں نے مجھے خطوط بھیجے ان کا میں تھہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اپنے خطوط کا ۔۔۔ خصوصاً جس قسم کے خط مجھے ملے ان خطوط کی ۔۔۔ اہمیت کا قیدیوں کو ہونے والا احساس انھیں جو کبھی قید و بند سے گزرے ہی نہیں کیونکر ہو سکتا ہے۔“

جنگ عظیم ختم ہوئی۔ ووڈھاؤس پر ہوئی نا انصافی پر برٹش پالیمنٹ میں گرامگرم بحث ہوئی۔ مکمل تفتیش ہوئی۔ ووڈھاؤس بے گناہ تھا یہ مان لیا گیا۔ موت سے سال ڈیرہ سال قبل برٹش ملکہ نے اُسے ”سر ہیلیم“ کا اعزاز عطا کیا۔ پر بوند سے گئی وہ حوض سے آتی نہیں۔ اُسے ایک ہی اطمینان تھا۔ جس نسل نے زندگی میں کبھی ہڈی گوشت کا بٹلر یا لارڈ نہیں دیکھا تھا۔۔۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دور کا انگلینڈ نہیں دیکھا۔۔۔ وہ نئی نسل بھی ستر سال پہلے کے اس کے قارئیں کی طرح لاکھوں کی تعداد میں اس کی کتابیں پڑھ کر جی بھر کر نہیں رہی تھی۔

۹۳ سال کا ووڈھاؤس، اس کی بیوی اتحل۔ اس کے بارے میں ولیم ناؤن ایڈ کو لکھے ہوئے خط میں ووڈھاؤس کہتا ہے۔

”خواتین کتنی ونڈرفل ہوتی ہیں نہیں؟ اتحل نے یہ سب کچھ کوئی شکایت کئے بغیر سہہ لیا۔ کتنا عظیم خوبصورت تھا اس کا رہن سہن! گذشتہ تیس برسوں سے وہ اپنے پیارے اور ناز برداری سے مجھے تحریک دلاتی رہی ہے۔ اس دوران نئی بلندی کو چھولیا تھا اس نے۔۔۔“

۔۔۔ شام کا وقت۔ بنگلے کے صحن میں وہ معمر جوڑا شیری پیتے بیٹھا تھا۔ ”نیو پارکر“ کا ایک مصنف

ہر برش وارن وِندِ مہمان بن کر آیا تھا۔ معمراً تھل اپنا شوہر تھی وی پر اسے بالکل سمجھ میں نہ آنے والا امریکن فٹ بال کا کھیل دیکھنے بیٹھ رہا ہوں کہہ کر مذاق کر رہی تھی۔ زندگی امریکے میں بتایا ہوا پلم یہ دل سے انگریز تھی رہ گیا۔ کرکٹ کی اُس کی سمجھ میں آنے والا کھیل۔۔۔ اور گولف، اُس کا تواہ استاد تھا۔ لیکن امریکن فٹ بال؟ کھلیتے کھلتے کھلاڑی ایک ساتھ آ کر گول دائرہ کیوں بناتے ہیں۔ پیٹ کر بال کس طرح بھگاتے ہیں۔ اس ووڈ ہاؤس کی بالکل سمجھ میں نہ آتا۔ پھر ووڈ ہاؤس کہنے لگا۔ ”اری مجھے امریکن فٹ بال سمجھ میں آتا ہے ایسا نہیں ہے۔ پر لطف کیا ہے وہ تجھے معلوم ہے؟“

وہ کھلاڑی دوڑ دھوپ شروع کرتے ہیں۔ اور درمیان میں ہی ایک ساتھ جمع ہو کر کھیل کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔“

کچھ وقت خاموشی رہتی ہے۔ بنگلے سامنے کی ہریالی کی جانب اور کنارے پر کے لمبے درختوں کی قطاروں کی طرف دونوں بھی سکون سے دیکھتے ہیں۔ پھر ووڈ ہاؤس کہتا ہے۔ ”کتنی خوبصورت لگتی ہے نا۔۔۔ ہریالی پر اتری ہوئی یہ شام کی دھوپ“۔۔۔

زندگی کی شام کے وقت بھی اس کے دل میں ویسی ہی ہریالی تھی۔ ویسی ہی دھوپ تھی۔ زمانہ قید میں اٹھائی ہوئی تکلیفیں اور اس میں بھی اس کے پیارے انگلینڈ نے اس کی کوئی خطانہ ہوتے ہوئے بھی نچلی سطح کی کی گئی کردار گشی، اس ضمیر کی ہریالی کا سبز رنگ اور روشنی، مثانہ سکی۔ جرمنی نے اتنی حالت بنانے کے باوجود پلم، تجھے جرمن لوگوں سے چونہیں آتی کیا؟“ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے پلم نے کہا تھا۔ ”جو انو، میں اس طرح تھوک نفرت نہیں کرتا۔“

اس روز ریل گاڑی میں میں نے ووڈ ہاؤس کی کتاب کھولی، پہلے ہی باب میں بنی پھوٹ نکلی، لیکن ہنتے ہنتے آنکھوں میں آنسو امداد آئے وہ صرف ہنسنے کی وجہ سے آئے ایسا نہیں لگا۔



(میتر)

## راو صاحب

”دے دان گھٹلے دان پڑھی جنمی مسلمان“ (دان دیا دان لیا اگلے جنم میں مسلمان) ایسا ایک ہمارے بچپن کا چھیڑ چھاڑ کا فقرہ تھا۔ دیا ہوا دان واپس لینے والے کو مسلمان ہی ہونے کی ضرورت ہے؟ دان بانٹنے کا کام کوئی مذہب کے لحاظ سے تقسیم نہیں ہوا ہے۔ لیکن ”دان“ کے ساتھ مسلمان کے ”اعزاز“ کا قافیہ ملتا ہے، بس صرف اتنا ہی اس کا مطلب تھا۔ لیکن دیا ہوا دان کسی بات کا خیال نہ کرتے ہوئے واپس لینے والا ایشور جیسا قوی داتا اور لیتا دوسرا اور کوئی بھی نہیں ہوگا۔

کسی ایک شخص کی اور اپنی ویولینٹھ کیوں مل جائے اور کسی دوسرے کی کیوں نہ مل پائے اس کا کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا۔ پندرہ پندرہ بیس میں سالوں کے شناسا افراد ہوتے ہیں لیکن سوائے تھوڑی دیر کے لئے غیر رسمی ملاقات سے آگے تعلقات نہیں بڑھتے۔ ان کے گھر آنا جانا ہوتا ہے۔ ملنا بولنا ہوتا ہے۔ لیکن ملاقات ہونے کے باوجود دل نہیں بڑھتے۔ اور کچھ لوگ لمحے بھر میں جنم جنم کا رشتہ ہوا یا طوق ڈال کر چلے جاتے ہیں برتاو میں رچی بسی سنجیدگی لمحے بھر میں ختم ہو جاتی ہے۔ وہاں جگہ کا انوکھا پن آڑنے نہیں آتا۔ وراثت میں ملی تربیت، زبان، لذت، پسند تا پسندگی..... کسی کے بھی سہارے کی ضرورت نہیں پڑتی، وہاگے جڑ جاتے ہیں، گانجیں بیٹھ جاتی ہیں۔

بیلگاؤں کے کرشن ہری ہر سے ایسے ہی ملاقات ہوئی۔ انھیں ہر کوئی ”راو صاحب“ کہا کرتا تھا۔ یہ راو صاحب جی انھیں سرکار سے عطا نہیں ہوئی تھی۔ پیدائش کے وقت ہی سے اپنے ساتھ لے آئے تھے اور آخر دم تک چھوٹ نہیں پائی۔ مناسب لمبا، سفید پتلے بال پچھے پھرائے ہوئے، قسم تصوریں کھینچنے کے لئے

بنائی جاتی ہیں ویسی پیشانی، دھوپی کی تہہ کی ہوئی دوٹا انگلی لیکن پٹونکا لے جیسی دھوتی پہننے، اور پریشمی شرت، اولن کوٹ، ایک ہاتھ کی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی، اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں چھوٹی انگلی اور بازو کی انگلی کے درمیان سگریٹ پکڑی ہوئی، اس کا چلم کی طرح کش لینے کا انداز، ضلع کلکٹر سے راستے کا بھکاری تک ہر کسی کو، ہر تین لفظوں میں ایک گالی کا لفظ استعمال کئے بنا اس شخص کا ایک جملہ پورا نہ ہوتا۔ مراثی کو ٹھوس کنڑی لب و لبجھ کنڑی کو اصل مراثی ساز۔ معمولی سرگوشی فرلانگ بھر دو رسانی دے اتنی نازک آواز! کسی بھی جملے کی ابتداء ”بھ“ کی آواز سے بننے والی گالیوں کے سوانہ ہوتی۔ مراثی پر کنڑی کے اثرات کی وجہ سے تزکیر دتائیں ہی نہیں اسم ضمیر، فعل، فاعل، مفعول، کی اتنی ثنکست و ریخت کرتے کہ دادا و بابا پانڈورنگ یادا ملے۔ بملے سب صرف دخودا لے چکرا کر گر ہی جاتے۔ صاف کیسے بولا جائے اور صاف کیسے لکھا جائے یہ قواعد پڑھ کر سمجھ سکے تو سمجھ لیا جائے لیکن دنیا کی نظر سے ساری آلو دگی کرنے والا یہ شخص میرے لکھنے کے قلم کی روشنائی جیسا پاک تھا۔ غصتے پر قابو پانا یہ خوش اخلاقی کی نشانی ہے ایسا سمجھ لیا جاتا ہے۔ راؤ صاحب سے اتنا ہونہیں سکتا تھا۔ اس کے باوجود راؤ صاحب خلیق تھے۔ کچھ لوگوں کے رہنم و برنا و کا طریقہ ایسا ہوتا ہے کہ اُن کے ہاتھوں سے شہد کا جھٹہ بھی کھل جاتا ہے اور کچھ لوگ دودھ تک تازی پینے جیسا پی جاتے ہیں۔ راؤ صاحب شوقین تھے لیکن شان و شوکت والے نہ تھے۔ زندگی میں انہوں نے بد نصیبی کے کئی روپ دیکھے تھے۔ پر بھوکا شیر کیا اپنی چال ادھرے کتے جیسا چلے گا؟ سونے کی تھالی میں پہلانوala کھانے والا دھنتر پھر راؤ ہری ہرنے و کالت کی گندگی کے اثر سے آنے والی اگلی زندگی میں کبھی کبھار بای روثی کے نکڑے بھی توڑے تھے۔ البتہ کچھ ہاتھوں کا لمس ایسا ہوتا ہے کہ اُن ہاتھوں میں کنہیر کے پھول بھی گلاب جیسے معلوم ہوتے ہیں۔ راؤ صاحب کی تربیت خاندانی صحیح پر یہ انسانی بھیڑ میں رہنے والا۔ بیرونی کانس سے بنا ہوا معلوم ہوتا۔ رنگ و یہاں تا نبوں کا لاتھا۔ سگریٹ پیتے ہوئے اس کا چہرہ لال اور کالے کے ملے جلے رنگ جیسا ہو جاتا۔ پھر دس میں پانچ بار اسے زور دار ٹھکانہ کا لگ جاتا۔ کیوں کہ وہ بھی بھی ناف کے ڈھنل سے پھوٹ نکلتی تھی۔ مسکراہٹ وغیرہ بھی کی نازک اقسام اس کے چہرے پر راس نہ آتے۔ ایک دم سات سے اوپر کی منزل۔

اس راجا آدمی کی اور میری پہلی ملاقات کو لہاپور کے شالینی اسٹوڈیو میں ہوئی۔ دس پندرہ سازوں

پر مشتمل سامان میں سامنے جما کر گاتا بٹھا رہا تھا۔ ریکارڈنگ سے پہلے کی صفائی (تیاری) چل رہی تھی۔ وشنو پنت جوگ اپنی پہاڑی آواز میں گارہے تھے۔ لئے کچھ گائیکی طرز کی تھی۔ جوگ کا اور پری سُرٹھیک بیٹھ گیا تھا اور سازوں کے میل اور سُر کے درمیان کوئی اوپنجی آواز میں چلا یا۔

” ہا....ن.....تیرے آ.....! ”

اتنی ٹھوس دادکس نے دی اس لئے گھبرا کر میں نے مُرد کر دیکھا۔ بال جبڑ راؤ صاحب کو لیکر آگے بڑھے اور مجھ سے کہا ” یہ بیلگاؤں کے کرش راؤ ہری ہرٹھیک ہے۔ ”

میں نے سلیقے سے نمکار کیا اور راؤ صاحب نے جیسے ہمارا اور ان کا اسکولی ساتھ ہو پینچھے پر مکا جمادیا۔ ” کیا شاندار گاتا ہے ہاں .....! ” راؤ صاحب کے منہ کے الفاظ جوں کا توں لکھنا بڑا مشکل ہے۔ جسم کی طرح دل کو بھی گبڑا پن آیا ہوا یہ لوگ پر لے درجے کا ..... پر لے درجے کا ہے ایسا کہہ کر چلاتے۔ (خوش طبع ماہرین چوکڑیاں بھرڈالیں)

” واہ ! ..... لیکن اتنے میں وہ تمہارا طبل جی سہم سہم کر بجا رہا ہے تو ..... اسے ایک تھوڑا کا پاج کا ..... طبلہ ایک تھوڑا سا چھپڑا زانیوالا بجائے کہونا ا..... سے۔ ” یہاں پانچ لفظوں کی گالی چھپڑا اڑا لے گئی۔ ویسے ہی آگے بڑھے اور اس طبل جی کو انہوں نے پوچھا۔ ” کس کا رے تو؟ ”

طبلہ بھی نے گھر انا بتایا اور مائک پر دھیئے بجانا پڑتا ہے وغیرہ وجوہات بتانے لگے۔

” پھر ریکارڈنگ والے کو یہ مائک کامنہ اور پرانھانے لگائیں آؤ تو۔ بلونت راؤ رکذی کر کا طبلہ نہیں نہ کیوں رے؟ کس لئے کل کی بات، ان کا ریکارڈ سن تو ..... اس کی آڑ تیرا یہ ..... کامائک کیوں نہیں آتا تھا رے ..... ؟ ” کہتے ہوئے مائک وغیرہ اور پرانھانے تھے ہوئے ” جمادے ہاتھ اب ” کہہ کر اس ریکارڈنگ پر قابض ہو گئے۔

اسٹوڈیو سے ان کا پرانا رابطہ تھا۔ ریکارڈ سٹ بھی آشناوں میں سے تھے۔ تھوڑی دیر ان کا اور ان کا اصل کو لھا پوری میں بحث و مباحثہ ہوا۔

” مجھے کیا بتا رہا ہے ریکارڈنگ سے متعلق ؟ ” پی۔ ایل۔ ایل۔ اجی یہ تمہارے ریکارڈ سٹ کھونٹ جتنے بڑے

تھے --- میری دھوئی میں پیشاب کرتے تھے ، اب موچھیں اونچی کئے مجھے سکھا رہا ہے دیکھئے --- اس کو لھاپور کے کراون سینما کانٹریل پھوڑا گیا وہ میری موجودگی میں رہے --- تو اُس وقت پیدا ہوا تھا کیا --- ہاں ، تیرے سازندوں کو لگا پھر بجانے --- طاقت نہیں ایک کے xxx ! یہ ایسا ناٹک جیسا اور ساتھ کیسا رے ڈھیلا ڈھالا ؟ تھو ! یہ کیا طبلہ بجارتہ ہے یا خود کی ران کھجارتہ ہے ؟ ” اتنا کہہ کر شھکا لگنے تک راؤ صاحب نہیں پڑے۔ راؤ صاحب کا یہ بہروپ میرے لئے نا آشنا ہو بھی تو ہمارے اسٹوڈیو کے لوگوں کو تو معلوم ہو گا ہی۔ کیوں کہ ان کے اس روشن سے ہٹ کر باتوں پر وہ دل کھول کر نہ رہے تھے۔ ریکارڈسٹ انھیں اپنے بوتھ میں لے گیا اور راؤ صاحب اس کا نجح کے عقب سے گردان ہلانے لگے۔ اُس شخص نے اپنی پہلی ہی ملاقات میں مجھے اپنی جیب میں اٹا رہا۔

اس کے بعد سال دو سال کے اندر ہی میں بیلگاؤں میں پروفیسری کرنے گیا اور پہلے دن ہی راؤ صاحب کے اڈے میں شامل ہو گیا۔ راؤ صاحب سینما تھیز کے کاروبار میں تھے۔ بیلگاؤں کے رنج تھیز کی بینھک کا اڈہ راؤ صاحب کا دربار تھا۔ اس دربار میں کئی نہ بولنے والے کردار جمع ہو جاتے۔ اس آرکیسٹر کے راؤ صاحب کنڈ کثر تھے۔ سیاست دانوں کو لیکن وہاں ممانعت تھی۔ کسی نے ممانعت تو نہ کی تھی لیکن ان کریسوں میں اعزازی کری نہ ہونے کی وجہ سے وہ ذات ادھر مڑتی ہی نہ تھی۔ رنج تھیز کے بازو میں ایک آفس کا چھوٹا سا بنگلہ تھا۔ اُس کے دروازے پر شام کو کریاں لگادی جاتیں۔ پنکھا شروع کر دیا گیا ہوا یہی شام کو چھبیس کے قریب اُس گلی سے ہوا کا جھونکا شروع ہو جاتا۔ ایک تو بیلگا می لوئی جتنی ہی ہوا بھی خوشی دینے والی۔ دھیرے دھیرے لوگ دن کے کاموں سے نپٹ کر وہاں جمع ہونا شروع ہوتے۔ اُس بینھک میں عمر کی علم کی، امیری کی، حاکمی کی۔ کوئی بھی پابندی نہ تھی۔ کسی کھلاری کلکٹر کا تک ” آیا اس کی ماں کا لوگوں میں تیلیاں ڈال کر ---“ ایسے ٹھیٹ الفاظ میں استقبال کرتے۔ راؤ صاحب کی گالیاں کھانے لوگ جمع ہو جاتے۔ پھر آہستہ سے وینکٹ راؤ مددھولکر راؤ صاحب کی چھیز نکالتے۔ وینکٹ راؤ مددھولکر پیشے سے راؤ صاحب کے شریک۔ لیکن بھائی بھائیوں نے کیا کیا ہو گا ایسا پیار۔ دونوں کا جھگڑا سننے کی چیز ہوتا۔ کسی اسکو لی بچ کی طرح وہ راؤ صاحب کو چھیڑتے۔

”کیا راؤ صاحب۔۔۔ آج پاؤڈر وغیرہ زیادہ لگائی ہے ۔۔۔“  
بس۔ اتنا ہی کافی ہوتا۔

”ہاں۔۔۔ بولئے کاڑی ماسٹر۔۔۔“ راؤ صاحب انھیں کاڑی ماسٹر کہا کرتے۔ ان دونوں کی رفاقت یعنی ایک عجیب معاملہ تھا۔ مدد حولکر خاندان سے ممتناع شفقت رکھنے والے، تو راؤ صاحب کے شرف قبولیت حاصل ہوا یہ سنار کی بدمقتو سے تھہ بھری ہوئی تھی۔ مدد حولکر نے احتیاط بر تھے ہوئے چھوٹے موٹے لوگوں کی بھلائی کی پرواہ نہ کریں تو راؤ صاحب ہنا سوچے دھوتی کھول کر دے دیں اور اپر سے کہیں کہ ”اپنے پاس پیسے نہیں اس لئے لوگ کیا برہنہ گھومیں پھریں کیا؟“ کہہ کر جھگڑا پیدا کرتے۔ البتہ جوڑی جنم گئی تھی لوگوں کے منہ پر ہری ہر۔ مدد حولکر ایسے جڑواں نام تھے۔

اس اڈے پر اسکول چھوٹنے کے بعد مسکل نائک ماسٹر آتے۔۔۔ گانے کے کلاس کے بچوں کو سارے۔۔۔ گا۔ ما، رٹنے لگا کرجی بھر کر ہٹنے اور ہنسانے وجا پور ماسٹر آتے، ڈاکٹر ٹکلکرنی۔ ڈاکٹر ہمن سینٹھ جیسے کامیاب ڈاکٹر آتے۔۔۔ کا ٹکلکر بُوا حاضری دیتے۔ پرشوتم والا ٹکر جیسا ماہر ہار مونیم نواز ”راؤ صاحب“ نگیت نائک جمایے کہہ کر بھن بھن کرتا رہتا۔ وشنو کیش کامت جیسا جگ یار چکر کاٹ کر جاتا۔ نیچ ہی میں رام کرشن پنت جوٹی جیسے دولت کے دھنی سا ہو کار آتے۔۔۔ بالا صاحب گندی جیسے انہتائی ہر دلعزیز پولیس افر آتے۔۔۔ موی بندھوآ کر بے تکا کر کے چلے جاتے۔۔۔ رات کو نوبجے تک بلا نامہ اڈہ جم جاتا۔ البتہ سب میں زیادہ گڑ بڑ راؤ صاحب کی رہتی۔ اُنکا جمی نام کا لگتا تھا۔ اس کی سمجھ میں بھی راؤ صاحب کی گالیاں آتی ہوں گی۔ وہ بھی ” یو یو یو یو“ کہنے پر قریب نہ آکر ”جھیا، ادھر آرے × × کی کہنے پر ہی قریب آتا تھا۔

سینما کے کاروبار میں راؤ صاحب کی زندگی بیتی۔ مینجری سے لیکر مالکی تک سینما تھیز کے سارے مدارج سے وہ گذرے تھے لیکن پندرہ پندرہ ہفتوں تک چلنے والے پچھر کبھی اندر بیٹھ کے نہیں دیکھا۔ نائک اور موسیقی یا اُنکے جی جان سے پیارے مضامین رو موضوع۔۔۔

کر نائک کے ویشنو بہمنوں کے گھر یعنی بے حد و قیانوی۔ اُن سارے گھرانوں کی پاکی، ناپاکی کی گزار

پر کسرت کرتے قدم بڑھانا تسلیم پر راؤ صاحب کے والد یعنی معروف وکیل۔ واڑے کے اس چودہ چوکڑیوں  
 والے راج میں باپ نامی راون کی مکمل حکمرانی رہتی۔ بچے اسی لئے جنم پاتے ہیں کہ انھیں پینا جائے، ایسا  
 ایک تصور تھا۔ نگتے باپ تک ہاتھ میں سدا چھڑی اٹھائے اپنے بیٹے کو اچھے برتاؤ کا سبق سکھانے آمادہ رہتا۔  
 یہاں تو کرتوتوں والا باپ۔ گھر سونے کے سکوں سے بھرا ہوا۔ ایسے اس پابند ماحول میں وشنو کے نام کے  
 جپ اور گرم مزاج رشتہ داروں کے پوجا پاٹ کی آوازوں کے درمیان کرشن راؤ کے کانوں میں بیلگاؤں تھیز  
 ناٹک سازوں کے سر کیوں کر پڑے یہ میرے لئے تعجب کی بات ہے۔ والد کی تیز نظروں سے فتح کر راؤ  
 صاحب نے بھاسکر بُو اسے تنگی رنگی تک سب کے گانے سُنے۔ بال گندھرو، باپوراؤ پینڈھار کر دینا تھا کہ  
 ناٹک سیدن ملک کی کریاں پکڑ کر دیکھ لئے۔ اسکوں، پڑھائی وغیرہ معمولی چیزوں سے جی بھر کرنفترت کی۔  
 اصطلاح عام میں ”بچہ بگڑ گیا“۔ شادی کا بندھن تک انھیں اس ماحول میں جکڑ کر رکھنے سکا۔ صاف ستھرے  
 سماج کی ہٹک چارزور دار گالیاں دے کر جھنک ڈالی۔ باپ دادا کی کمائی جائیداد پر نظر نہ رکھ کر اپنی پسند کی ڈگر  
 پر چل پڑے۔ اکلوتے بیٹے کے نام کر کے اس دولت پر انہوں نے پانی پھیرا اور اپنی روٹی خود کمائی سے  
 کھانے لگے۔ فقیری اختیار کی اپنی خوشی کی فقیری عجب ہوتی ہے۔ اس پر وہ پرانا دور۔ کان پر ہاتھ رکھ کر  
 گناہوں سے انکار کے کالم میں پوشیدہ انگشت باتوں کی فہرست۔ فہرست کے اثبات کے کالم میں سب ’نفی‘،  
 درج! لیکن سرود کی سُنگت جمی ہوئی۔ اپنے واڑے کے اچھے ماحول کی کھڑکیوں کی سلانہیں توڑ کر وہ باہر نکلے  
 اور محفل کی دل زبا کی سلاخوں سے رشتہ جوڑ لیا۔ وہ دل زبا لیکن کبھی ان کے قابو میں نہیں رہی۔ محفل میں ان کا  
 رول محض خاموش سامع رہتا شائی کا رہ گیا۔ ان سرود کا بھوت جوان کی گردان پر قابض ہو گیا وہ آخر تک نہیں  
 اُتر۔ یہ نہ اُترنے والے بھوت،۔ نارائن راؤ بال گندھرو کے الپ کی طرح اس قیمت پر والد کے ہاتھوں کی  
 مار کرشن راؤ نے کیوں کھائی، یہ بات وہی سمجھ سکتے ہیں جو اس شوق کے دیوانے ہیں۔ لوگوں کے خیال سے گھر  
 سنوار کو تیاگنے والے اس امیر کی فقیری، صرف جمع خرچ کی بیاض میں پڑھنے والوں کی سمجھ میں نہیں آئی۔ خود  
 کے والدین کی یادوں سے نہ رونے والا یہ شخص ”موپے ڈار گیو“ کی یادوں سے کیسے اُداس ہو جاتا۔  
 گانے کی دنیا میں رہنے والے شخص کے یہ آنسو انسانیت کا انوکھا رنگ دکھا جاتے ہیں۔ گلوکار۔ گلوکارہ نے

لگائے ہوئے سُرود کے خزانے کی رسیداں کی وفات کے بعد سوائے اشکوں اور کس سے لکھی جائے! جانے دو! کسی کی زندگی کو چوکٹ راس آتی ہے تو کسی کی زندگی رنگوں کے دانوں کی طرح بکھرنے کا مزہ لیتی ہے۔ رنگوں کا ہر دانہ جہاں گزے اپنارنگ چھوڑ جاتا ہے، ویسے یہ لوگ جہاں جاتے ہیں اپنے ساتھ اپنارنگ لئے جاتے ہیں۔ گھر کے چورا ہے میں، مہدہ ب سماج کی چوکٹ میں ان کے رنگوں سے مشابہ رنگ نہیں ملتا انھیں پھر اپنے سے ملتا رنگ ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ ان لوگوں کا خاندان نرالا، خاندانی تربیت نرالی۔۔۔ ضرورت میں پوری نہیں ہوتی۔ چاہے جتنا اس سے بیچنے کی کوشش کریں لیکن یہ چوکٹ نصیب سے جوی رہتی ہے اور زندگی کی لکیر بڑھتی ہی رہتی ہے۔

گھر کا کوئی بھی رواج نہ پالنے والے راؤ صاحب کو گانے بجانے کے رسوم بھانے کی انتہائی خواہش، راگوں کے نام تک وہ پہچان نہ پاتے تھے لیکن چھٹے ہوئے سُرفوراً دھیان میں آتے ان کے ”گلی بھول گیا کیا وہ پی ایں؟“ بھری محفل میں پوچھ بیٹھتے۔ ایک آدھ راگ کے کپڑے کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے یارا گنی کا پلو سرک جانے کا احساس انھیں فوراً ہو جاتا۔ ”سو برمان اپمان“ میں رنگنے والا یہ شخص ” وہ اندھے کی اسکوں ناٹک کر دی جی۔ قومی ناٹک ہے ابھی وہ۔ کیشور راؤ دانے اور جو تنا بھولے کیا ادا کاری کرتے تھے وہ ہاں! تجارتی سطح پر وہ فیل ہو گیا لیکن لوگ xxxxx کا !“

اس انجان شخص کو کچھ الگ ہی جانکاری تھی۔ طبیلے کے گائے بیلوں کو منگل۔ منگل کی ہوتی ہے اس طرح۔ ایک بار بیلگاؤں میں کسی کمپنی کا ”ماتاپمان“ ناٹک تھا۔ میں اور راؤ صاحب بازو بازو میں بیٹھے تھے۔ جو گلیکر ”دینا ناٹھ“ پنڈھر پور کر رہا جیسے معتبر گلوکاروں نے گائے ہوئے بول ان کے کانوں میں تھے۔ وہ گانے نئے اداکاروں نے گانا شروع کرتے ہی راؤ صاحب کی کھسر پُسر چار صفوں تک سُنائی دے ایسی شروع ہو گئی۔

”یہ کیا دھیر دھر کیوں جی؟ اس پر اس بھامنی کا کتنا خوش ہو گیا کیا؟ برج کے بینڈ والے کی طرح نظر آتا ہے یہ! ساڑیاں دھورے بھامنی کی۔۔۔“

میں لگاتا رہا انھیں خاموش کئے جا رہا تھا۔ اس روز اس دھیر دھر کے پارٹیا (ساتھی) کو بھی نہ جانے کیا

اٹی سو جھی ایشور ہی جانے۔ اُس نے ”یاول نیوتوا“ کی لئے بدل کر وہ اڑتا گاناڈھی لئے میں شروع کر دیا۔ یہاں راؤ صاحب آگ بگولا ہو گئے۔ اُس گانے والے اداکار کے جھوٹے دل بھانے والے سُروں کے ہر موز پر راؤ صاحب کی جو گالیاں جاری تھیں وہ اگر اُس اداکار کے کانوں پر پڑتیں تو وہ ناٹک پیشہ چھوڑ کر گنور کھشن سنتھا کا صندوق پیچے ہاتھ میں لئے پھرتے رہتا۔

سین ختم ہوا۔ (پرده گرتا ہے)

”پی ایل۔۔۔ چلیئے جی۔۔۔ اُس دھیر دھر شندلی سے ملاقات ہو پاتی ہے کیا دیکھتے ہیں آؤ۔۔۔“

”جانے دیجئے راؤ صاحب“۔۔۔ میں نے حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے کہا۔

”تم بھی روزا انکانے میں نمبر ایک۔۔۔ چلو جی۔۔۔“

ہم اسٹچ کی جانب گرین روم میں گئے۔ ”وہ دھیر دھر کی پارٹی کچھ ادھر کہاں ہے جی؟“ کہتے ہوئے راؤ صاحب اندر داخل ہوئے اور اس تین چاند کے صاحب اعزاز سے پہلا سوال پوچھ لیا۔

”تمہارے باپ نے بھائی تھی کیا اس نوشوا کی لئے؟ وہ پرانی لئے بد لئے کیا ضرورت تھی تھیں؟“ دھیر دھر کی بولتی بند ہو گئی تھی اور وہ لکشمی دھر ہو گیا تھا۔

”اجی وہ بھا سکر ہوا جیسا اور گوند راؤ ٹیمبا جیسے ماہر گلوکار لئے باندھ چکے تھے وہ کیا گنجہ پی کر لئے باندھتے تھے جی؟“

”لیکن ہم تبدیل نہیں کر سکتے کیا؟“ بیچارے نے مناسب ہمت بخانی۔

”بدل دونا۔ دینا تھو منگیشکرنے نہیں بدلی تھی کیا؟ ہمارے باپ کی ہمت تھی کیا انھیں پوچھنے کی! لیکن وہ ان کا حق بناتا تھا۔ اس کی ایک تان تم لو اور دیکھو کہ اصل میں کچھ خامی آتی ہے یا نہیں۔ چال بدلتی ہے تو اُس کے لئے مہارت کی ضرورت ہے۔ تمہارا گلا یعنی سُروں کا ایرینڈیل ہو جائے ایسا بے اثر۔ اور پھر چال کیوں بدلتے ہو کہہ رہا ہوں۔ کسی بال گندھرو جیسے کے پاؤں پکڑ اور سارے گانے وغیرہ ٹھیک سے بٹھاتو۔ جتنا نہیں تو پھر خواہ مخواہ اونٹ کی ڈم کے برے کو چووم رہا ہے میں نے کہا۔ کیا ضرورت تھی جی! گائیکی خاندان کے اصول پال تو۔ بلا ضرورت کراہنا کس لئے؟“

راؤ صاحب کے لئے جتن کرنے جیسا خاندانی دھرم الگ ہی تھا۔ اس شو قین شخص کو اسٹچ پر زکنی، سُبھدرا کا پلہ

سرک جانا بھی پسند نہ آتا ۔

”اُجی“ یہ زمینی کیا بیلگاؤں کی بوگاروں کی بستی میں رہتی تھی کیا رے؟“ کہہ کر ناراضگی ظاہر کرتے ۔

”تارائِن راؤچ بائی نہ ہوت بھی پلو مضبوط رکھا جائے اور یہ کیا ہے جی یہ ؟ تھو xxx !“

تحمیر کہیں تو لڑکیوں کی ہمیشہ بھیڑ۔ ایسے وقت اس رسایا شخص کی آنکھوں کی پتلیوں کی جگہ صرف رعب رہتا کبھی کوئی غنڈہ یا کوئی موالی اس بھیڑ میں کسی لڑکی کو چھیرنے کی شرارت کرتا نظر آئے تو پولیس کا انتظار کئے پنا اس کو پیٹتے۔ تحمیر کے نوکر چاکروں کی کیا مجال غیر فائدہ اٹھانے کی! وہاں گالیوں کے ساتھ ہاتھ میں ہنڑ رہا کرتا تھا۔ شوق کرنا ہو تو وہ مناسب وقت و جگہ پر ضرور کئے جائیں اور کھلے عام کے جامیں ایسی طبیعت کا یہ شخص سنکرتی، اصول، سنجیدہ اور سنجیدگی جیسے الفاظ بھی ان کی سمجھ میں نہ آتے۔ ماں بہنوں جیسے لفظوں کا ذہونگ بھی نہ رچاتے لیکن رہن کا بُردار دپ فوراً ان کے دھیان میں آتا۔ کسی دوست کے گھر میں ہیں اس لئے جملے احتیاط سے استعمال کئے جائیں وغیرہ نفاست انھیں معلوم نہ تھی۔ کسی ناٹک میں گندے فقرے آئے تھے اس لئے ہم سے کہہ رہے تھے ۔

”کیا کہوں بھابی ۔۔۔ کیسا تھا وہ ناٹک؟ ایسا گندہ لکھنے والے کے xxx ! بھو xxx کو اندازنا گا کر xxx !“ اپنی باتوں میں چند خطرناک لفظ آئے تھے اس کا ان کے دل کو احساس تک نہ ہوتا ۔

”اُجی راؤ صاحب، خواتیں کے سامنے بولنے میں تو ۔۔۔“

”ساری (Sorry) ہاں بھابی ۔۔۔ ہماری زبان یعنی اس کی xxx دیکھو“ یہ اُس پر طڑہ! اور اس طرح راؤ صاحب کی طرزِ گفتگو کا ان کے دوستوں کے گھروں میں تک پچھا انوکھا نہ لگتا۔ چھوٹے بچے کے شرث اور پرانا کر گھومتے پھرتے رہنے میں کوئی غیر مہذب طریقہ نہیں لگتا ایسا ہی ان کا اسلوب تھا۔ چار گالیوں کا تیکھا پن شامل کئے ہنا اپنے جملوں کا صحیح مطلب نہیں نکل سکتا کہیں ایسا تو وہ سمجھنہیں بیٹھے تھے، بھگوان جانے! لیکن ان کا غصہ اور پیار دنوں بھی تیکھے رہتے۔ ان کی خوراک تو بے حد تیکھی۔ ہری مرچ کی کچوریوں کی طرح کھاتے۔ اُس سے پیدا ہونے والی متوقع تکلیف آخر کار پیدا ہو ہی گئی۔ ڈاکٹروں نے سخت پرہیز پر رکھا۔ میئنے بھر میں اس شیر کی بکری بن گئی تھی۔ ایک دن وہ پریشان ہو گئے اور کوئی ہوئی مرچ کا

اچھا خاصہ گولہ کھالیا۔ اٹھا کر اپتال میں لیجا تا پڑا۔

اس شخص میں بے حد خودداری تھی۔ دل کی بات دل میں دبائے رکھنا یہ ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ بیلگاؤں میں آرٹ سرکل نام کا بقول راؤ صاحب 'گانے بجانے کا کام کرنے والا، ایک ادارہ تھا لیکن ادارہ کے قوانین وضوابط کے مطابق ثقافتی پروگرام کرنے والا ادارہ ہے اس ادارے کی راؤ صاحب زندگی تھے۔ جی جان سے محنت کر کے اور اپنے ساتھیوں کے تعاون سے اُسے مقبول بنادیا ہے۔ ممبئی میں بھا۔ لے راؤ نے یا تا گپور میں تانا جوشی نے اس کام کے لئے جان قربان کر دی ویسے، ہی بیلگاؤں میں راؤ صاحب نے۔ آرٹ سرکل یہ ان کا مقصد تھا، ان کی دیوانگی تھی۔ اچھے اچھے گلوکار نگیت کاروں کی محفلیں منعقد کرتے۔ شائقین کو اکٹھا کر کے نائک کرتے اور سال میں ایک بار نئے گانے بجانے والوں کے لئے مقابلے رکھے جاتے، ایسے کام وہاں بلا نامہ ہوتے رہتے ہیں۔ اس کشمکش کے دوران راؤ صاحب کو مہینہ مہینہ بھر فرست نہ رہتی۔ سارے بیلگاؤں کے شوqین سماج کے لئے یہ کشمکش یہ مقابلہ والوں اگنیز واقعہ بن جاتا۔ راؤ صاحب تو اس طرح پیش آتے مانو یہ ان کے گھر کا ہی کام ہے۔ منہ سے لفظوں کی تجھیں نکلتی ہوئیں سارے کارکنوں کو تیز دھار پر رکھا ہوا خود کے پیے خرچ کر کے آنے جانے والوں کی مہمان نوازی کرتے۔ کے ڈھال ملیگی، کون نمبر حاصل کرے گا اس موضوع پر اسکول کے طلبہ کے اس جوش و خروش سے شام کے اڈے پر بحث و تکرار رہتی۔ گھر میں بیچاری کاشی تائی راؤ صاحب کے اس سرگوشی بھری بیداری اور بے وقت کے مہمانوں کی خاطر تواضع سے تحمل ہوئی گھر کی چار دیواری کے بیچ رہ کر "میں" اور "میرا" کہنے والی یہ جان نہیں تھی۔ امارت کی ہوا میں بڑی تعداد میں جسم سے گذر جائیں تو بہت سارے لوگوں کے دلوں میں لقوہ بھر جاتا ہے اکثر اوقات لوگ شکست سے زیادہ کامیابی سے بھی گھبرا جاتے ہیں۔ راؤ صاحب کے من کے فولاد پر مختلف قسم کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ اس پر زنگ نہیں لگ سکتا تھا۔ ان کی میری اتنے سالوں کی پہچان میں کبھی میں نے نُستی سے پڑا ہوا نہیں پایا۔ کچھ بھی کرتا ہو تو "آوا بھی کر لیتے ہیں" فلاں فلاں کی گیتوں کا پروگرام طئے پایا کہ "کارڈ لو۔۔۔ ابھی لکھ ڈالو۔ پھر وہ کہیں اور چلا گیا تو پریشانی نہ ہو۔۔۔ صبر دھیرے دھیرے کریں گے، ایسی زبان ہی نہ تھی ان کی۔ خیال اور عمل ان میں کسی قسم کی مشکل نہ تھی۔ اس آرٹ سرکل کا میں نے ایک نائک بٹھایا تھا۔ کام کرنے کے

لئے گاؤں کے بھی شائقین تھے۔ راؤ صاحب کے رنج تھیز میں ناٹک رکھا گیا تھا۔ صبح نوبجے ناٹک کا وقت۔ میں میری بیوی اور ایک دوادا کارا یے پیشگی تیاری کی خاطر صبح پانچ سازھے پانچ بجے تھیز گئے۔ دیکھا تو راؤ صاحب ہاتھ میں جھاڑو لئے اسٹچ کی صفائی کر رہے ہیں اور نوکر لوگ چوروں کی طرح کھڑے ہیں! میں نے کہا۔

”اجی، یہ کیا ہے راؤ صاحب؟“

”تم منہ کورنگ لگانے کا دیکھلو۔“

”اجی، لیکن آپ کیوں جھاڑو لگا رہے ہیں؟“

”پھر کیا ان XXX سے کہوں؟ ارے، آج ناٹک یعنی بھابی کام کریں گی۔۔۔ ہمارے سنس صاحب کی صاحبزادی۔ ہوا۔ اچھے گھر کی لڑکیاں کام کریں گی۔ ان کے پاؤں میں اسٹچ کی میخ وغیرہ لگ جائے تو! ان حرامزادوں کو کیا پرواہ ہے ان کی؟ جھاڑنے کہا تو صرف جھاڑو پھیرادیں گے اور پانچے اوپر کئے صرف بیڑیاں پھونکتے بیٹھ جائیں گے خاموشی سے۔ ان کے باپ نے بھی صاف کیا تھا اسٹچ۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے دیکھا تو تمن میخیں ادھر XXX! تم چلو بھابی۔۔۔ تو X X کامیک آپ والا آیا نہیں ابھی تک۔“ جملے کے ایک ایک جھٹکے کے ساتھ سونے کی جھاری میں دودھ پیا ہوا مالک تھیز میں جھاڑو دے رہا تھا۔۔۔ ہماری بال بچیاں دہاں چلیں گی۔ پاؤں میں کیلیں جائیں گی اس لئے۔۔۔

ناٹک شروع ہو گیا۔ شو قین لوگوں کا کیا ہوا یہ ناٹک جتنا اچھی طرح ہونا چاہیئے تھا ہو گیا۔ سر سے پانی کا بھرا کلس اندھیل دیا جائے ویسے راؤ صاحب کے چہرے سے تعجب و خوشی پیک رہی تھی۔ دو چار مہینوں کی تعلیم کی محنت۔ آخر شائقین ہی نئھرے وہ لہذا ان میں سے چند کاروٹھنا سب کچھ تھا۔ ناٹک پورا ہونے کے بعد دو پھر میں گھر میں آ کر سو گیا تھا۔ نیند میں ایسا لگ جیسے کوئی پیٹھ پر سے ہاتھ پھیر رہا ہے۔ میری آنکھ کھل گئی۔

”خوب محنت کی تھی آپ نے۔“ راؤ صاحب میرے کاث پر بیٹھے تھے۔

راؤ صاحب میرے کچھ بھی نہ تھے۔ گائیکی کی یا ناٹک کی انہیں بہت معلومات تھی ایسا بھی کچھ نہ تھا۔ ادب وغیرہ کے سائل سے ان کا تعلق ہی نہ تھا۔ میں کالج میں مراثی پڑھاتا ہوں، یعنی کیا پڑھانا ہوتا ہے اُس میں

صاحب؟“ ایسا ان کا سوال رہتا۔ کتاب تو در کنار لیکن روز نامہ تک پڑھنے کی انہوں نے زحمت گوارہ نہیں کی۔ سیاست اور اس سے متعلقہ لوگوں سے انہیں بے حد نفرت تھی۔ کسی بھی پروگرام کے لئے کسی لیڈر کو مدعو کرنے کی بات آجائے تو راؤ صاحب پہلے مخالفت کرتے۔ ہمارے اڈے پر کسی نے سیاست چھیڑی کہ راؤ صاحب ”ڈال رے اس XX کو لیجا کر بارہ گڑھوں کے کنویں میں“۔ غصے میں آ کر کہتے۔ ”یہ جا کیٹ نہ روہاں XX کے؟“۔

بیلگاؤں یعنی کنشری۔ مراثی تازعے کی سُلگتی بھئی۔ ایک بار رائے شماری ہوئی۔ راؤ صاحب نے اپنی مادری زبان مراثی لکھنے پر کسی نے انہیں چھیڑا۔

”یہاں پر مراثی ناٹک کے لئے بھیڑ رہتی ہے یا کنشری کے لئے رے XX کے۔ دکاندار کا بورڈ جس زبان میں لکھا جاتا ہے وہ اُس گاؤں کی زبان۔۔۔ کچھ تو گانے والے کے بارے میں کہو جی، کنشری اور مراثی دونوں بھی لیکر ڈال دیجئے وہاں“۔ وہاں یعنی کہاں یہ اڈے کے سبھی لوگوں کو معلوم تھا۔

گلوکاروں اور موسیقاروں پر بے حد پیار تھا ان کا۔ کئی بار ان کی مالی مشکلات دور کیں۔ کسی معمولی ہار موئیم نواز یا طبلہ نواز کو ساتھ لیکر جاتے ہوئے ایسا چلتے مانو کسی اعلیٰ سرکاری عہدیدار کو ساتھ لئے جا رہے ہیں۔ ایک بار سرکل میں ولایت خان کے ستار بجانے کا پروگرام تھا، رنج میں مہمانوں کو ظہرانے کے لئے ایک خوبصورت کرہ تھا۔ وہاں خان صاحب کے ظہر نے کا انتظام کیا گیا تھا۔

کھڑے ہو جاتے ہیں۔ موسیقی کے سننے کی تعلیم کے دوران میں نے توڑی متعدد بار سنبھالیں ہیں لیکن دو توڑیاں میرے دل میں گھر کر گئی ہیں۔ ایک پونے میں کیشور راؤ بھولے کے گھر میں ملکا ارجمن نے گایا تھا، وہ اور دوسرا بیلگاؤں کے اس آرٹ سرکل میں ولایت خان صاحب نے رات ڈھلنے کے وقت بجا یا تھا وہ۔ خان صاحب نے توڑی کے سروں کی لہریں نکالی تھیں۔ ان کی انگلیوں کی بھلی سرایت کر گئی تھی۔ جلے کی جگہ سے ہم رنج کے اس گیٹسٹ روم میں آئے۔ خان صاحب بستر پر دراز ہو گئے تو راؤ صاحب کے ان کے پاؤں دبا نا شروع کر دے! وہ ان کے جسم کو رکڑنے لگے۔ خان صاحب شرمندہ ہوئے۔ راؤ صاحب اپنی اعلیٰ اردو میں ان کی تعریف کر گئے۔ بوقت ضرورت بختنی سے پیش آنے والے راؤ صاحب کو گھاٹل ہوا پایا کہ اس برازش کے پتلے

کے دل میں کھلکھلاتا ہوا زم پانی نظر آتا۔ راؤ صاحب تہذیب سے دور تھے وہ کتنا اچھا تھا! ہم سمجھوں کو اس دن خان صاحب کے پاؤں پکڑ لیں ایسا لگتا تھا۔ راؤ صاحب نے پکڑ لئے۔ سنجیدہ تہذیب، سماج میں اپنی مقبولیت وجگہ، تمدن۔۔۔ کوئی بھی کواڑ راہ میں نہیں آیا۔ دل کے کواڑ کھول کر چلنے والے یہ لوگ۔ اندر سید ہے سید ہے جھاٹک لیا جائے اس لئے ان کے برتاو میں سختی نہ تھی۔ ہیسمی آواز میں بولنے کی نفاست نہ تھی اچھوں کے لنگوٹی یا راور بروں کا لکڑی لیکر پیچھا کرنے والی ایسی یہ ایک عجیب چیز تھی۔

آرٹ سرکل کے لئے جی جان پنچاہر کرنے والا یہ شخص اعزاز پانے کے وقت غائب ہو جاتا۔ اسٹج پر بیٹھنے کا موقع آجائے کسی بھی مشکل میں نہ لڑ کھڑا نے والے راؤ صاحب کی زبان میں رعشہ پیدا ہوتا۔ سید ہے گاڑی میں بیٹھ کر بھاگ جاتے۔ زندگی میں اُن پر ہارڈ اے گئے وہ صرف اُن کی میت پر۔

بیر رکھا وہ بھی مرد انگلی سے۔ اُن کے ایک دوست کے ساتھ کسی کار و بار میں سا جھا تھا۔ کسی پنا پر اُن دونوں میں نفاق پیدا ہوا۔ ایک محفل کے وہ ساتھی۔ کٹھور برتاو کی وجہ سے اُس دوست کو ان پر دعویٰ کرنا پڑا۔ بیلگاؤں کے کورٹ میں پہلی تاریخ پڑی۔ ہمیشہ راؤ صاحب کے یہاں قیام کرنے والا وہ دوست بیلگاؤں کے ڈاک بنگلے میں نہ ہرا۔ راؤ صاحب کو وہ بات معلوم ہوئی۔ وہ سید ہے وہاں پہنچے اور وہاں اُترنے کے لئے اُس پر گالیوں کی بوچھار کر دی۔

”تمہارا اور میرا جگہڑا پچکانے کے لئے وہ نج بٹھا تو دیا ہے سرکار نے عدالت میں۔ ہر ماہ X ہزار ہزار روپے سرکار ڈال رہی ہے اُن کے۔۔۔ اُدھر وکالت کے لئے کورٹ میں اپنا وکیل دیا ہے تم نے ہمارا بھی ہے X کا!۔۔۔ تمہارا وکیل دیوالہ نکال رہا ہے تمہارا۔ سچ کہیں تو۔۔۔ اُسے چھوڑ ڈالنے لیکن تم یہاں کیوں اُترے شرم وحیا چھوڑ کر تم سے کہہ رہا ہوں۔۔۔ X تم آؤ گے اس لئے وہ سکی کی بوئی منگوائی ہے وشنو سے کہہ کر وہ کیا X X X X X؟“ اگلے جملے لکھنا ممکن نہیں ہے۔ معتر و معزہ زشہریوں کو اُس کے پیچھے پھٹھی مضبوط انسانیت نظر نہیں آئی۔۔۔ گالیاں ہی دکھائی دیں گے۔

دن بھر عدالت میں لڑنے والے یہ عجیب مدعا۔ مدعا عالیہ شام کی محفل میں رنگ گئے تھے۔ اور سے اس دوست کو اس کا وکیل کس طرح دھوڑا لئے والا ہے وہ اس کے پیالے میں وہ سکی اثاثیلیتے اٹھانے بتا

رہے تھے۔ راؤ صاحب کے لئے نہ تو شراب ممنوع تھی اور نہ ہی لٹ گئی ہوئی تھی۔ ان کی ضروری نشہ کی چیز ایک ہی۔ ”” دوست ”“ -

اور ایک بار ”” دوست ”“ کہدیا تو پھر اسکے سکھ ڈکھ کی ساری ذمہ داری ان کے سر پر۔ ان کے رنج کے اُس خوبصورت کرے میں بیٹھ کر میں اور رام گبائے ”” دودھ بھات ”“ پکھر کے لئے کہانی تیار کر رہے تھے۔

”” یہاں اطمینان سے بیٹھ کر لکھنے، ڈسرب کرنے کوئی آیا تو اُس کی کمر پر لات مار کر باہر نکال دوں گا ”“ -

”” راؤ صاحب ۔۔۔ لات وغیرہ کی ضرورت نہیں، صرف کہیئے ”“ -

”” اجی کہانی لکھنا کچھ ایزی (آسان) ہے کیا؟ ۔۔۔ نیچے میں ہی کوئی آیے گا ۔۔۔ خواہ مخواہ X کا وقت بر باد کریگا ۔۔۔ لنک ٹوٹ گیا تو سب کچھ گیا XXX میں ۔۔۔ ”“

ہمیں مطمئن چھوڑ کر راؤ صاحب گئے۔ دس پندرہ منٹ کے بعد پھر لوٹے۔

”” شوری شروع کر دی کیا؟ ”“

”” نہیں ”“

”” ٹھہریے۔ آج ایک لفظ بھی لکھنا نہیں ہے، آج شیں کا وہ اماوس جو ہے۔ نہیں نہیں ! ”“ -

”” جانے بھی دیجئے صاحب ”“ -

”” نہیں چلیں گا۔ اج چلنے چاہیئے اپنا پکھر! ”“ اپنا پکھر! راؤ صاحب کا اس پکھر سے کوئی بھی تعلق نہیں تھا۔ لیکن اب وہ دوست کا کام یعنی گھر کا معاملہ تھا۔ دراصل راؤ صاحب دیو دیو کرنے والوں میں سے نہیں تھے۔ میں نے کبھی بھی انھیں ماروتی، وشنوکرتے نہیں پایا۔ لیکن نیچے کسی کے ساتھ بات کرتے وقت کسی نے انھیں آج اماوس ہے کہہ دیا اور ”” کس لئے آج شروع کر رہے ہیں کہدیں ”“ بولتے ہی وہ دوڑے آئے۔

اُس کرے میں کوئی آکر ہمارے کام میں زکاوث نہ ڈالے اس کا مکمل بندوبست کرنے والے راؤ صاحب بذاتِ خود پچاس بار آکر چلے جاتے۔ ”” ہاں، آگے کیا ہوا؟ ”“ ایسا پوچھتے اور اپنی ڈرستیاں سمجھاتے جوانوں کی رہتیں۔

”” پی ایں، ایک بیٹ سمجھش ! ”“

”کہیئے۔“

”تمہاری وہ ہیر و نین۔ کیا نام ہے اسکا؟“

”اروندھتی۔“

”ہاں! وہ ارون دھتی رہتی ہے تا اسے تھوڑا استارسٹ بنائیے۔ خواتین نے استار بجانا چاہیئے جی،“  
یہ ایک راؤ صاحب کا کیسا پاگل پن تھا بھگوان جانے۔ ان کی موڑ گاڑی کی پچھلی کانچ پر بھی ایک استار بجانے  
والی عورت کی تصویر انہوں نے چپا کر دی تھی۔

”راو صاحب لیڈی استارسٹ کیا کیجئے؟ ایک مندر کے بھث جی کی بیٹی وہ۔۔۔ وہ استارسٹ کیسے بن سکتی  
ہے؟“

”پھر باپ بدل ڈالنے تا اسکا۔ باپ کو تھر کھوا کی طرح طبلہ پلیر بنائیے۔“

”مندر کا بھث جی کیا دیوتا کے سامنے پاک لباس پہن کر طبلہ بجانے بیخا ہے ایسا دکھاتا ہے کیا؟“

”دیوبدل ڈالنے تا۔ ایک تھوڑا استار اور ٹھان ٹھان طبلہ دیکھو۔“

آگے اس کہانی میں وہ اداکارہ حاملہ رہتی ہے ایسا منظر رہتا ہے۔ کہانی کا وہ حصہ سن لیا۔ آدھ پونے گھنٹے کے  
بعد واپس لوٹے۔

”تمہاری کون جی وہ ہیر و ن؟“

”اروندھتی۔“

اس نام کے ساتھ انہیں کیا بیر تھا کون جانے۔ آخر تک وہ ان کے ذہن میں نہیں رہا۔

”ہاں ا اسے بچہ ہوا کیا؟“

”ہو گیا۔“

”کیا ہوا؟ لڑکا یا لڑکی؟“

”لڑکا۔“

”چلو اچھا ہوا۔ لیکن یہ یاد رکھیے جی۔ خواتین آڈنیس کے روئے کے لئے وہ بچہ ماروارمت ڈالنا۔“

اور دوبارہ آکر پوچھتے ”وہ ہیر و میں کا بچہ کیسا ہے؟ مارو گے اس لئے کہہ رکھتا ہوں۔۔۔ بڑے آدمی مارڈا لوہ  
بچہ کس لئے؟ بچہ مار کر لوگوں کو زلا کر پیسے کانا یعنی پاپ ہاں! تو! وہ ہیر و میں کے باپ، بھٹ جی رہتا ہے  
وہ۔۔۔ بوڑھاتو ہو گا وہ۔۔۔ مارڈا لوہ سے۔۔۔ رو میں جورونے دیجئے لوگوں کو۔۔۔ بچہ مت ماریئے۔۔۔  
ہماری وہ کہانی لکھ کر پوری ہونے تک راؤ صاحب فکر مند تھے۔ اپنے کمرے میں پکھر کی کہانی لکھی  
جاری ہے اُس کی دھن سوار تھی اُن پر۔

”تمہاری یہاں سوری چل رہی ہے یہ کے معلوم ہو کر فائدہ نہیں۔۔۔ سکریٹ رہنا چاہیے“۔۔۔ کہنے والے  
راو صاحب نے ہمیں ڈسٹریکٹ کرنے والوں کے پاؤں توڑنے کی دھمکی دیتے ہوئے راؤ صاحب نے وہ  
سکریٹ نصف بیلگاؤں میں بتا چکے تھے۔ اُن دنوں میں انھیں چین نہیں تھا۔ ہم پانچ سات گھنٹے کہانی  
پر کام کر کے شام کو اڈے میں آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ وہاں راؤ صاحب۔۔۔ ”وہ تمہارے اُس اروندھتی کا  
ہسینڈ رتح کے نیچے مر گیا۔۔۔ بہت بُرا ہوا ہاں۔۔۔ پاپ۔۔۔“ کبکر ہماری سمجھ کر ارہے تھے۔ پری کھدا  
پڑھنے والی لڑکی کو جس طرح ہوتا ہے اور اس طرح چیج کا کو ابھی چیلکی کی بدعا سے کو ابنا ہوا راج پُتر  
(شہزادہ) ہی ہے ایسا لگنے لگتا ہے، ویسا اُن کا حال ہو چکا تھا۔

اُس پکھر کے میں گیت لکھ رہا تھا۔ راؤ صاحب ہر پانچ منٹ کے بعد ہو گیا کیا گیت؟ کہتے  
ہوئے آتے۔ میں بیچارہ ”دیوا“ کے لئے ”سیوا“ اور ”پریتی“ کے لئے ”بھیتی“ جانے کی فکر میں  
تھا۔ راؤ صاحب آکر کب کھڑے ہو گئے پتہ ہی نہ چلا۔

”اس کی ماں کا ایک اتنا سا گیت لکھنے کے لئے کتنا وقت ہاں؟“

”راو صاحب، ان میں بڑی مشکلات رہتی ہیں۔ یہ دیکھئے اب۔۔۔ اُز لی پر اچی، پر اچی کا ہم قافیہ ڈھونڈنا  
ہے۔۔۔“

پھر میں نے انھیں قافیہ کے مسائل سمجھا کر بتائے۔

”یعنی اب پر اچی کا جوڑ ڈھونڈنا تکلیف کی بات ہے نا؟“

راو صاحب چلے گئے میرے ایک دو شعر لکھ کر ہو گئے۔ دو پھر میں راؤ صاحب پینے میں شراب اور کمرے میں

حاضر۔

”پی ایل ۔۔۔ ایک تھوڑا ”کچی“ جتنا ہے کیا دیکھو ۔۔۔  
”کچی؟“

”اجی وہ ۔۔۔ پر اچھی کے لئے ۔۔۔ وہ کیا مُواکہ رہی تھی وہ ۔۔۔ ڈھونڈنہیں رہے تھے تم! ”کچی“ میں چی  
نہیں آتا ہے کیا آخر میں؟“

راو صاحب قافیہ کے بندھن سے اپنے دوست کو چھڑانے آئے تھے۔ ہمارے اس گیت میں ”کچی“ بیٹھنہیں  
پاتا کہنے پرانھیں بے حد ذکر ہوا تھا۔ کسی دن کوئی ایک آدھا یا باہت تکا سوال کر بیٹھتے کہ ان کے اس ذرا ورنے  
چہرے کی جگہ بچے کی معصومیت جھلکتی۔

”پی ایل ۔۔۔ ماں کا تم اتنے ایم اے ۔۔۔ ہمارا ایک سempl سوال بتاؤ ٹا ۔۔۔“  
”کہیئے“

”آدمی ایسا کھدہ رپہن کر لیڈر کیوں بن جاتا ہے جی! کہیں ستار نہیں، کہیں ناٹک و انک دیکھنا نہیں ۔۔۔  
خواہ مخواہ X کے ہار گلے میں پہن کے گھومتا پھرے۔ ایک شادی کہہ کر نہیں کرنی ہے یعنی نہیں! ایک  
اچھی سی عورت رکھنے کی وہ نہیں۔ یہ اس طرح کیوں کرتے ہیں جی وہ؟“ اور پھر وہ لیڈر ہوا میں کھڑا ہے اس  
طرح وہ کہنے لگے۔ ”ذراد دوست وغیرہ رکھ کے بیٹھنے لگے ۔۔۔ بیکار ہی وہ مائیکروفون کے سر میں زبان ٹکائے  
بڑ بڑ کرتے ہیں سالے۔ سو جا آرام سے اوپر پیچھے کا حصہ اٹھائے ۔۔۔ کہیئے تو“  
”اب کیا کہیں سر“

”چا X X X، اجی ایم اے ہوتا ہے تو کالج میں پڑھنا پڑتا ہے۔ کتابیں پڑھتے ۔۔۔ امتحان دیجئے ۔۔۔  
مصیبت ہی رہتی ہے جو ۔۔۔ کہیں گویا بننا ہے تو تم بورہ لیکر گلا پھاڑتے بیٹھنا پڑتا ہے۔۔۔ لیڈر بننا ہے تو وہ کیا  
کرتے ہیں کہنے کو؟“ راو صاحب کے سوال کا جواب نہ مل سکا مجھے۔

اس شخص کے میں نے طرح طرح کے ایسے روپ دیکھے۔ ایک آدھا آدمی ہر طرح سے کیا ہے وہ  
کون کہہ سکیگا! راو صاحب جس طرح مجھے نظر آئے ویسے سمجھوں کو لگے ہوں گے ایسا اصرار میں بھی کیوں

کروں؟ اُن کے ہاتھوں سے کچھ بھی مروڑ انہیں گیا ہو گا ایسا بھی نہیں ہے۔ خود بیلگاؤں میں بھی اُن کے بھی دوست تھے ایسے تھوڑے ہی ہے۔

دائی دشمن کے لئے چالاکی کی ضرورت ہے۔ وہ تو اُن کے یہاں بالکل ہی نہیں تھی۔ پر ایک بات یقینی تھی۔ اس شخص میں کوئی کوتا ہی نہ تھی۔ اڑیل پن تھا، ضد تھی۔ بات منوانے کی خوبی بھی ہو گی۔ جوانی میں بیلگاؤں میں رہائش ہو گی ناممکن نہ تھا۔ البتہ جو بھی خوبیاں خامیاں تھیں وہ اپنے اپنے وقت پر ضرور صاف دکھائی دی ہوں گی۔ چھپانے کا کام اُن سے ہونہ سکا۔ ثواب، عذاب کا نصاب بھی مختلف تھا۔ ایسے ہی ایک دفعہ ایک شب ہم تین چار دوست اُن کے رینج کے کمرے میں گاتے دیتے بیٹھتے تھے۔ راؤ صاحب موڈ میں نہ تھے۔ اُن کا دھیان مھفل میں نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ خاص مھفل جم جاتی تو وہ جسم کا کوٹ شرت اتار کر بغیر بنیان پتلامل کا پیرا، ان زیب تن کے بیٹھ جاتے۔ اب تک کوٹ شرت جسم پر ہی تھا۔ پرشوتم والا لوکر کے لئے ”شرناگتا بجا بھی رے تھوڑی سی“۔ اس طرح فرمائش نہیں کی تھی۔ کچھ دیر بعد نوکر کو آواز دی ”امیر“ امیر آیا۔ دوسرے کسی کو بھیج دے کہدیا۔ دوسرا نوکر تھر تھراتے آکر حاضر ہوا۔ راؤ صاحب اُٹھے اور انہوں نے اُسے ایسی گالیاں دیں جو نہ ماضی میں دی گئی ہو گئی اور نہ مستقبل میں دی جاسکتی ہیں۔ اپنی مرضی کے مطابق بول کر ہو گیا پھر اپنی جیب کی پاکٹ سے پیسے نکالے، اُس کے ہاتھ میں تھما دئے اور کہا۔ ”جا‘ X، ہکل صحیح جمع کردے یہ دفتر میں“۔ اُس شخص نے راؤ صاحب کے پاؤں پکڑ لئے، اور اچھا خاصدار میانی عمر کا وہ شخص چھوٹے بچے کی طرح آوازنکال کر رہا اور درحقیقت آنسوؤں سے اُس نے راؤ صاحب کے پاؤں بھگوڑا لے۔

”جا۔ اب۔۔۔ یہوی آئی اسپتال سے یاد ہیں ہے اب تک؟“

”لے آیا گھر۔“

”کیوں؟ داخل کر اُسے وہاں۔ ڈاکٹر سے کہہ آیا ہوں میں۔“

اس شخص نے انہیں کے دفتر کے پیسے کھائے تھے۔ پولس میں جانے کی نوبت آئی تھی۔

”غربی ہاں غربی، انسان کو غلاظت کھانے پر مجبور کرتی ہے۔ انہمارہ سالوں سے ہمارے یہاں کام کر رہا ہے، یہوی کی ہیلتھ بگڑ گئی ہے۔ کچھ فٹی بی وی بی ہو گی۔ سینما کی نقد رتم آتی ہے۔ کیسے دل کو قابو میں رکھا جائے؟

ہاتھ بڑھ گیا۔ آٹھ بجوں کا باپ۔ کیا اسے جیل میں رکھیں کیا؟“

”چوچ سچ کہیں تو سیدھے آپ کے پاس مانگ لیتا۔“ کسی نے کہا۔

”تم بھی عقلمند شہرے دیکھئے۔ میں کچھ تکلیف میں ہوں، دے تھوڑے سے پیے، کہہ کر مانگنے پر کوئی دیتا ہے جی؟ میری بیوی سکھ نہیں دیتی۔ ایک لڑکی دیتے ہو کیا اپنی؟، پیشہ ور طوائف کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ گھر میں تھوڑا بہت سکھے ملے تو آدمی طوائف کے پاس کیوں جائیگا ہاں؟“

ایسا سادہ سیدھا فلسفہ لے کر یہ شخص جیتا رہا۔ کسی نے اسے عقلمند کہا، کسی نے بیوقوف کہا، کسی نے اسے مہذب کہا، کسی نے نشہ باز، کسی کی نظر میں وہ بُرے ہونگے۔ سکھوں کی گالیاں کو سماستہ اور ڈھنائی سے لوٹاتے رہنے والا یہ شخص کہیں نہ کہیں رنجیدہ تھا۔ اکیلے رہیں تو ان پر بے حد اداسی چھا جاتی۔ اپنے جمی کو لئے تھیز کے قریب صحن میں کری ڈال کر اکیلے بیٹھے رہتے اور نواسوں، پوتوں کے ساتھ کھلیں اس طرح اس کے ساتھ کھلیتے رہتے۔ ان کے چوچ پوتے اور نواسے تھے لیکن وہ ہوتے بھی تو ان کی گود میں نہ کھلیں ایسا کچھ اٹھا پاس پڑا ہوا تھا۔ پیاسے کو پانی نہ ملے یہ تو قانون کا پرانا کھیل ہے۔ راؤ صاحب کی سنوار کی بساط پر کچھ مہرے اُلٹے پڑے تھے، اُسے کوئی کیا کر سکتا ہے؟

لیکن یہ تہائی انھیں راس نہ آتی۔ پھر رات گئے گاڑی نکال کر تملک واڑی ہمارے گھر آتے۔

آتے وقت اپنے ساتھ ہار موئیم نواز والا لوکر، ایک آدھا بھرتا طبلہ نواز کو اٹھاتا تھا۔

”چلنے، ذرا گاتے بیٹھے جائیے تا۔ اس کی ماں کا چھپلے جنم میں ہم نے جانے کیا پاپ کیا تھا۔ ایک ساز بجانے آئے تو حرام۔ دیو کہیں تو وہ بھی کیسے حرام خور جی۔ جنھیں ضرورت نہیں ان میں لیجا کر انڈیل دیا ہے۔“ اور پھر راؤ صاحب کے ساتھ رت جگا ہوتا۔

دن کیوں کر بیتتے یہ سمجھ میں نہیں آیا اور ایک دن بیلگاؤں کا ہمارا شنیر (حصہ) ختم ہوا۔ کس کا جھونٹا کس گاؤں میں کتنا گرے اس کا بھی کوئی قاعدہ ہو گا۔ کالج کی انتظامیہ کمیٹی کے ارکان اور اساتذہ میں نفاق پیدا ہوا۔ ہم سات آٹھ لوگوں کو کالج کے مالکوں نے نکال دینے کے نوٹس جاری کر دئے۔ بیلگاؤں کو الوداع کہہ کر ذریعہ معاش کی تلاش کا وقت آگیا۔ جس گاؤں میں مجھے بے حد پیار ملا وہ گاؤں چھوڑ کر وہاں سے

بیلگاؤں کے پلیٹ فارم پر الوداع کہنے آئے ہوئے دوستوں اور ساتھیوں کا مجمع لگا تھا۔ اُس اشیشن پر پونے جانے والا فرست کلاس کا ایک ڈبہ جوڑ دیا گیا تھا وہ یارڈ میں ہی تھا۔ وشنو کیش کامت نے براہ راست وہاں لیجا کر سامان رکھ دیا۔ بنگلور میں آگئی۔ ڈبہ جو جانے کے بعد دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو اندر راؤ صاحب نے ہمیں معلوم کئے بغیر ہمارا کمپارٹمنٹ اندر سے پھولوں سے مزین کر دیا تھا۔

میں نے اور میری اہلیہ نے اب تک آنسو کا باندھ روکے رکھا تھا وہ بچھوت نکلا۔ یہ سارے لوگ کون تھے ہمارے! ایک کالج میں معمولی یکھر۔ تھوڑا سا گانے بجانے والوں میں۔ تھوڑا ناٹک سینما میں رچا بسا۔ یہاں نہ اقربانہ ساتھی..... کوئی یہاں، کوئی وہاں کہتے ہوئے بس رکرنے والا۔ پلیٹ فارم پر خون کے رشتہ دار کوئی نہ تھے۔ شاگرد، احباب، ساتھ۔ اڈے پر کے دوست۔ عمر سے، عہدے سے، دولت سے کافی بڑے لوگ۔ انہوں نے ان تکلفات سے عزت افزائی سے ہمیں دم بخود کر دیا۔ گاڑی چلتے چلتے راؤ صاحب چھوٹے بچے کی طرح روتے ہوئے چلائے۔

”کس لئے آئے تھے ہاں بیلگاؤں میں؟“

سال بیت گیا۔ پونے ہی میں ہمارا گھر تھا۔ جس دن ہم نے بیلگاؤں چھوڑا تھا، ہی تاریخ تھی۔ سینچر تھا۔ رات کو کھانے کے لئے ہم بیٹھے تھے۔ بیوی نے یاد دہانی کی۔

”ٹھیک ایک سال پہلے اسی روز ہم نے بیلگاؤں چھوڑا تھا۔“

دروازے کی گھنٹی بجی۔ تار آیا تھا۔ وینکٹ راؤ مددوکر نے تار میں لکھا تھا۔ راؤ صاحب رحلت کر گئے۔ کل صبح جلوس جنازہ ہو گا۔ فوراً نکلو۔“ دوسرے ایک راؤ صاحب کے دوست فوراً موڑ گاڑی نکال کر بیلگاؤں جانے والے تھے۔ انھیں آتے وقت مجھے ساتھ لانے کی تاکید کر دی تھی۔ وہ مجھے لئے بغیر نکل پڑے۔

اس سے قبل پندرہ دن نہیں گذرے ہو نگے راؤ صاحب اور کاشی تائی ہمارے گھر پونے میں آئے تھے۔ بیلگاؤں میں آرٹ سرکل کے لوگوں نے ناٹک بٹھایا تھا۔

”فرست کلاس ہو گیا ہے۔ تصحیح آتا ہی ہو گا۔“ خواہ مخواہ لگا۔ اُس ناٹک کے لئے، آؤں اس لئے تو جھونٹا تار

کر دیا ہوگا؟ کہاں کا کیا؟ اس قسم کے تاریخ جھوٹے نہیں ہوتے۔ پیر کی ڈاک سے راؤ صاحب کے ہاتھوں کا لکھا خط آیا۔ آج رنگیت تعلیم تھی۔ تم دونوں کو نانک کے لئے آتا ہی ہوگا۔ ورنہ یاد رکھئے۔ منہ نہیں دیکھوں گا تمہارا۔“

وہ رنگیت تعلیم ہو گئی۔ راؤ صاحب خوش ہو گئے۔ مجھے جلدی سے جلدی میں خط لکھا۔ کسی کو سپرد؛ ڈاک کرنے بھیج دیا اور نانک میں کام کرنے والے گروپ کو تھیسیر میں بیٹھا کر ان کے لئے بہترین کھانا لانے کی غرض سے بازار خود گاڑی نکال کر چل پڑے، اور گاڑی چلاتے چلاتے سینے میں درد اٹھا۔ گاڑی روک دی اسٹرینگ پر گردن ڈال دی وہ آخری۔ ورنہ عام طور پر بیلگاؤں سے شہاپور جاتے ہوئے دس لوگوں سے۔ ”شہاپور سے جا کر آتا ہوں رے،“ کہتے ہوئے چھینتے چلاتے گزرنے والے راؤ صاحب جہاں سے واپس لوٹا نہیں وہاں جاتے ہوئے البتہ کسی سے بھی کہے بغیر چلے گئے۔

ایک دو دنوں کے اندر ہی میں بیلگاؤں چلا گیا۔ رنج تھیسیر کے دفتر کے صحن میں اس طرح کر سیاں بچھائی ہوئی تھیں۔ مدھولکر، ڈاکٹر ہنمن سیٹھ، ڈاکٹر ہنمن سیٹھ، کاگلکر بُوا، نانک ماشر، وجہاپورے ماشر، سارا اڈے والا گروپ خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ صرف محفل کا بادشاہ نہیں تھا۔ تھیسیر کے اس ہنگامہ خیز آنکھ میں نانا چھایا ہوا تھا۔ وشنوکیش کامت، سے سکلی روکی نہ گئی۔ کسی نے کہہ دیا پی ایل۔۔۔۔۔

”سارا بیلگاؤں غم میں غرق ہو گیا دیکھو۔“

راؤ صاحب کو جا کر اب بارہ سال پورے ہونے کو ہیں۔ ریڈ یو کے ستار پر کچھ جھنک جاتا ہے۔ واولہ پیدا کرنے والی دوستی کا پرانا رشتہ یاد آنے لگ جاتا ہے۔ لیڈی ستارست کی یاد سے بنی بھی آتی ہے اور رونا بھی آتا ہے۔

کئی سالوں سے دوبارہ بیلگاؤں نہیں گیا۔ وہاں کے احباب کہیں مل جائیں تو کافی اصرار کر کے بلا تے ہیں۔ بیلگاؤں میں مجھے کھینچ لی جانے والے میرے دوست با بو راؤ ریگے اور وہاں میرا جی لگانے والے راؤ صاحب! با بیلگاؤں بھی چل بے۔ راؤ صاحب بھی سدھا رے۔ ایشور نے ہماری چھوٹی سی زندگی

سوارنے کے لئے دئے ہوئے یا انمول تھائے بن مانگے عطا کئے تھے، بن کہے واپس لے لئے۔



## (گنگوت)

## رُگ و پیدی

بہت دنوں کے بعد میں امسال گپتی کے لئے پارے چلا گیا۔ میرا گھر اور میرے نانا کا گھر بھی پاس پاس ہی ہیں۔ بڑی سڑک سے اندر گلی میں داخل ہونے کے بعد جہاں وہ گلی ختم ہوتی ہے وہیں پر سامنے میرے نانا کا چھوٹا سا بیٹگہ ہے۔ اس بیٹگہ کے چھوٹے سے دیوان خانے کی کھڑکی سے سامنے والی اندر کی جانب مُڑنے والی گلی نظر آتی ہے اور گلی کے ناکے پر آئے ہوئے شخص کو اس کھڑکی کا آدمی با آسانی نظر آ سکتا ہے۔

گلی کے ناکے پر میں آیا۔ حسب معمول دور نظر آنے والی اس کھڑکی کی طرف دھیاں گیا۔ لمحہ بھر کے لئے انوکھا احساس ہوا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے میں اس کھڑکی کے پاس پہنچ جانے پر، آج برسوں سے بلا نامہ سنائی دینے والی پیار بھری آواز سنائی دیگی۔ نہیں بالکل میرے کا نوں پر کہیں سے وہ آواز سنائی دے رہی ہے ایسا احساس ہوا۔

”آیلو، رے پتا؟“ (آیا، منے) میں نے کھڑکی سے اندر جھاٹک کر دیکھا۔ ان خانہ خالی پڑا تھا۔ بہت بھی کھلا پڑا تھا۔ دیوار پر صرف نانا کی تصویر نگی ہوئی تھی۔ دوسرے دن آنے والے گن راجا کے لئے آسن تیار کیا گیا تھا۔

”آیلو، رے پتا؟“ اب یہ آواز سنائی نہیں دیگی۔ نانا کے گذر جانے کو ایک سال ہو گیا تھا۔ خالی دیوان خانے میں جا کر میں بینچ گیا۔ پورا نھیاں میرے گرد جمع ہو گیا۔ صرف نانا اور نانی کو چھوڑ کر۔ میں اس کھڑکی

والی کری پر بینہ گیا۔ سامنے کے راستے سے دور دیکھنے لگا۔ بچپن میں شام کے وقت ہم نواسے نوایاں ناتا کے آنے کی اس طرح راہ تکتے بیٹھے رہتے۔ دفتر سے وہ تشریف لائے کہ ان کے گرد ہم جمع ہو جاتے پھر کسی کے ہاتھ پر زرداں کے بال رامائیں تو کے صرف بوئے ایسی خیرات ہوتی۔ دیے لگ گئے کہ رامائیں، مہا بھارت کے قصے شروع ہو جاتے۔ ان کے دفتر جانے کا لباس۔۔۔ سفید ڈھیلائگرتا شفاف دھولی، سر پر سفید رومال، پاؤں میں کونی چپل اور پیشانی پر لال تلک، ایسا ہوا کرتا تھا۔ پلے ویچی کیلوں کے سو کھے جھلکوں کی راکھ اور ہلدی چندن کو ابال کروہ یہ گندھ تیار کرتے۔ ہمیں وہ خود گندھ لگاتے (اس زمانے میں ہمیں اسکوں میں گندھ کے پانچ نمبر ملا کرتے تھے) اس کے بعد ہم نواسے نوایاں، پوتے پوتیوں کی جانب سے (اس وقت ہم دو تین ہی تھے، اب بہت ہیں) آفس سے اونٹے وقت کیا کیا لیتے آئیں اس کی فرمائش کی جاتی۔ شام کو حصولیابی کے لئے ہم اس کھڑکی میں بینہ کر ان کی راہ تکتے رہتے۔ دور ان پر نظر پڑی کہ گلی کے ناکے تک ہم دوڑ پڑتے اور کسی کے ہاتھ میں ان کی چھتری، تھیلی۔۔۔ اور پھانک تک پہنچتے پہنچتے کسی نہ کسی نواسے پوتے کے سر پر ان کا رومال چڑھا ہوارہتا، اور ”ا نا آئے، اقا آئے“ کی الاؤپس میں وہ گھر تشریف لاتے۔

مبینی شہر کے بالکل قریب ہوتے ہوئے بھی اس وقت پار لے پر کونی سادگی کی چھاپ تھی۔ اب اگر پار لے چلا جاؤں تو بڑھی ہوئی آبادی، گندی ہوئیں، ان میں تینوں زمانے گاہ چاڑتے ریڈ یا اور مختلف دیش کے مختلف لوگوں کا مجمع دیکھر ”ہو گرین واز مائی دیالی“، کہنے کو دل چاہتا ہے۔ ناریل، آم کی ساری باڑیاں عنقا ہو گئی ہیں اور وہاں اب بنگلے تعمیر ہو گئے ہیں۔ ایک دوسرے کو چبا جائیں یا نگل جائیں اس جذبے کے ساتھ بعد از جنگ زمانے کے جزرے میں پھنسے ہونے کے باوجود زندہ رہنے کی سعی کرنے والے انسان وہاں بھیز بنائے بکر ہے ہیں۔ پار لے یہ ایک زمانے میں چھونا کہنے تھا۔ جوشی کے یہاں بچے کی رسم جنیو ہوئی تو ناماٹار سے لیکر خوشال یہٹھ تک سہوں کے گھر میں تقریب منعقد ہونے کا لطف پیدا ہوتا۔ گاؤں میں کھاناوں (لنگر خانہ جہاں مناسب داموں میں کھانا ملتا ہے) کا اچھی طرح چلنا ممکن نہیں تھا۔ کوئی بھی کسی کے بھی گھر جا سکتا تھا۔ وہ گھر اس کے لئے اپنی نہ ہوتا۔ اب وہ لوگ جوانسانیت نواز دور میں گذر بر کرتے تھے آج ایک

دوسرا کے لئے اجنبی بن گئے ہیں۔ اس وقت ہر کس کی کہیں نہ کہیں عقیدت مندی تھی۔ کہیں نہ کہیں گاؤ جوڑا ہوا تھا۔ چھوٹا سا تلک مندر۔ رات میں چرچ کی طرح گھنٹا بجا کہ لوگ دیا کھیان۔ پران کے لئے جمع ہوں و یے گھر میں پابندی سے جمع ہو جاتے۔ دیا کھیان کی تشبیر کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ صبح اکھاڑے کی دھوم رہتی۔ چار مہینوں (اشاڑھتا کار تک) میں ایک لاکھ نسکار پورا کرنے کا نسکار اچار یہ سون کا عہد، گھر کی مذہبی رسومات کی ادائیگی کی ذمہ داری کی طرح، سارے پارے کی ہی رہتی۔

دادا صاحب پار دھمی، چاندی والے پرانچے، میرے نانا، ایسے اس کنبے کے کرتا دھرتا لوگ۔ ان کے کنبے پر پارے چلا کرے، انھیں بھائے ایسا پارے بولے۔ گاؤں کے کسی بھی غلطی کرنے والے بچے کا کان یہ بزرگ ہستیاں پہ حیثیت آبا و اجداد مرد لیں۔ کسی بھی بچے کی ہمت افزائی کے لئے اس کی پیٹھ سہلانے یہی بزرگ آگے بڑھتے۔ اپنے بھلے بُرے برتاوے سے پارے کو نیچا دیکھنا پڑیگا اس کا احساس بچپن ہی سے ہمارے میں میں رچا رہتا تھا۔ ان سارے اجداد کی دیکھ بھال میں سوڈیز ہسونوں سے پوتے پروان چڑھ رہے تھے۔ چاندی والے پرانچے شری منٹ جنہوں نے تلک و دیالیہ کی مالی ذمہ داری کا بوجھا اپنے سر اٹھایا ہوا تھا۔ دادا صاحب پار دھمی سخت فوجی مزاج والے۔ کامنے ہے جھکائے پارے کا کوئی لڑکا یا لڑکی چل رہی ہو تو دادا کی زور دار دھپ پڑی پیٹھ پر۔ ان کے باغ کے آنگن میں پورے گاؤں کے بچوں کا کھیل کا میدان تھا۔ ٹشتی کے لئے ریت ڈالی ہوئی۔ پچاس لوگ بے یک وقت تیر سکیں ایسا تالاب جیسا وسیع و عریض کنوں کھودا ہوا۔ اور ہمارے اتنا۔ انہوں نے سارے لڑکے لڑکیوں میں حسن اخلاق پیدا کرنے کی ذمہ داری ملی تھی۔ کہیں کرتن کی مجلسیں منعقد کر تو کہیں فنسلکر ماشر جی کو لیکر گیتا کی کلاس چلا، پانڈو پرتاپ، ہری وجیا کے قصے سوڈیز ہو بچوں کو جمع کر کے سُناتے بیٹھ جائیں ایسے کام چلتے رہتے تھے ان کے۔ سر تھرام داس، چھتر پتی اور اوک مانیہ یہ تین، سارے گاؤں کے لئے قابل تقلید! پونے والوں جیسا ہنگامہ تو نہیں تھا لیکن پونے والوں کی طرح کام کرنے کا ایک جذبہ تھا۔ غریب لکرک پیش افراد کا یہ گروہ اپنی آنکھوں کے سامنے ہمالیہ جیسے بلند اصول رکھ کر راہ چلنے کی سعی کر رہے تھے۔ جنگ عظیم کی مہنگائی کی ضرب لگی اور سہوں کی کریں ٹوٹ گئیں۔ کسی کے دماغ میں دولت کا نشہ چڑھ گیا تو کچھ غربت کا شکار ہو گئے۔ پارے کی ریز ہی بڑی ہی ٹوٹ گئی ڈھیلے ڈھالے

ہماریڑھ والے خود غرض انسانوں کے جم غیر میں ہمایہ جیسے بلند اقتدار کب کے پکھل گئے۔ لوگ بے حس اور دور از دھرم ہو گئے۔ ایک خوبصورت بستی پر نئی تہذیب کا بنا بھر گیا۔ انسان بن کر جینے والا یہ گروہ زمین کی سطح برابر ہو گیا۔ زندگی بھر سینے سے لگائے رکھے ہوئے اقتدار کی بربادی دیکھ کر میرے نانا اور ان کے معاصر اصول پرست لوگوں نے نئے حالات کے صد میں سب سب اپنی جان گنوادی۔

میرے نانا کے انتقال کے بعد میرے ایک ایڈیٹر دوست کا مجھے خط آیا کہ تم ان پر مضمون لکھو۔ تمہارے نانا ”دیا نہ باتی“ ایسی حالت میں بخلاند ہیے جائیں۔ مجھے لگا، راج گھاث کی سعادتی پڑنیا کے آخری ”انسان“ کی سعادتی جہاں ہم نے ڈھونگی نمکار کی غرض سے رکھ چھوڑی ہے وہاں یچارے میرے ”وام منگیش ذبھاشی“ نام کے نانا کس کھیت کی مولی ! --- راج گھاث پر سے یاد آیا۔ میرے نانا کے قد و قامت اور رہن سکن میں گاندھی جی سے خوب مشابہت تھی۔ ”ندیانہ باتی“

مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے جب میں ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھا۔ گوا کے مشہور شاعر بور کر۔ اُس زمانے میں وہ اس قدر مشہور تھے۔ ہمارے نانا سے ملنے آئے تھے۔ آج ایک شاعر اپنے گھر تشریف لائے گا، اس لئے میں پاٹ کے نیچے رکھ کر استری کیا ہوا پا جامہ اور قمیض پہن کر شاعر کا انتظار کرتے بیٹھا تھا۔ نیلا سوت پہنا ہوا اور خوب لمبے خوبصورت بالوں والا یہ شاعر کچھ گنگتا تھے ہوئے آیا اور اُس نے سیدھے میرے نانا کے پاؤں پر اپنا سر رکھ دیا۔ مجھے خواہ مخواہ شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ اتنا خوبصورت سوت زیب تن کیا ہوا شاعر ہمارے چوٹی والے نانا کے پاؤں پر سر رکھ کر نمکار کرنے جیسا باولا ہو گا ایسا اُس وقت مجھے محسوس نہیں ہوا۔ آج جب یہ یاد آیا یعنی اُس روز اُس دیوان خانے میں سب میں باولا میں تھا، یہ سمجھ میں آگیا۔ بور کرنے اُس دن کتنی خوبصورت نظمیں کہیں! لفظوں سے زیادہ لئے کی بنا بر اک وقت۔ وہ نظمیں میرے ذہن میں رہ گئی تھیں۔

۱۔ ”چپل تجھے چرن ذرا بھاگھری استھاوے ، تیھے کرمائھے زلتی“۔ اب تک یہ منظر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ یہ ہنسی دے اُنی جیانی نیز شر / گھردے مانوتے چے مندر / پری جیا نچیا دہن بھوجی دوڑ / ناہی چیرا ناہی پتتی --- ”جنخوں نے (انسانیت کی) جنگ میں اپنا سر نچھا ور کر کے انسانیت کا مندر کھڑا کیا لیکن ان کی آخری آرامگاہ پر نہ دیا ہے اور نہ باتی“۔

(۱) تیرے تیز قدم کچھ پر یہاں شہر جائیں۔ وہاں میرے ہاتھ جو جائیں۔)

یہ مصرع سنتے وقت نانا کی آنکھوں سے پانی کی دھاریں نکل پڑی تھیں۔ زندگی کو یہ ہینا کی تشبیہ پر روندر کی پسندیدہ تشبیہ زگتے آئندیدہ ہینے آمار نمترن۔

آئندیدہ ہینا سی آئے نمترن مانوی جیون دھنیہ زھالے! خوشی خوشی جان نچحاور کرنے دعوت آئی انسانی زندگی کا مقصد حاصل ہوا۔

بور کر تو ہوڑ زاتلو پتا ” (بور کر، تو بڑا بننے والا ہے، بیٹا!) بور کر کو گلے لگا کر نانا نے دعا کیں دیں  
— مجھے یاد آتا ہے، اتکیا شن نہ آے آئی مرنا ” (اتنی جلدی موت نہیں آئیگی)

اس نظم کی زندگی کی خوشیوں کی فہرست میں ” مسلی چا سوادُ نا ”، (محفلی کی دونی لذت) کھانے کے تصور سے میری نانی فوراً ہنس پڑی اور دھیرے سے ” آبا! آج گاںکار گوہا! ” (اری بائی! سچا گوہا والا ہے یہ ہاں!) ایسا میری ماں سے کہا۔ نانا کے دیوان خانے میں نانی کو بھی با احترام جگہ حاصل تھی۔ بہت زیادہ دانشورانہ گفتگو نہ ہو، تو شعری ادب کی مزاجیہ گفتگو میں نانی بھی شامل ہو جاتی۔ نانا کے ساتھ رہ کر نانی بھی ان کے رنگ میں مکمل رنگ گئی تھی۔ ان کے جس مزاج بہت تیز تھی۔ نانا کے بے پناہ دانشورانہ برتاو کی وجہ سے انھیں نانی کی طرف سے دھرم راج، ہریش چندر وغیرہ پر ان والے خطاب ملے۔ نانا کی گفتگو و بحث سے زیادہ ہمیں اس کی گفتگو و بحث اچھی لگتی۔ کوئی محاوروں کا استعمال اس کی باتوں میں زیادہ رہتا۔ اپنی بات کسی پیپل کے اپانچ، کسی تو تعلیٰ چرد اہے وغیرہ کو دھیان میں رکھ کر پیش کرتی۔ اکثر وہ نانا کو لا جواب کر دیتی ہو گی کیونکہ نانا اس پر خفا ہوتے اور نانی ” لوکا سانگے برہما دیان ” (لوگوں کو بڑی بڑی باتیں سنائے) جیسا فقرہ چھوڑ کر بات کو ختم کر دیتی۔

۱

پر کچھ ہو لیکن اپنے نانا بہت بڑے دانشور ہیں ایسا مجھے محسوس نہیں ہوتا تھا۔ ان کی مجموعہ کتب میں سے ایک بھی کتاب ہماری دانست میں قابل مطالعہ نہ تھی۔ جدید رومانی ادب کی انھیں بھنک نہیں تھی۔ ہری بھاؤ آپ کے بعد تاول لکھے جا رہے ہیں اس کا انھیں علم نہ تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ پونے گئے تو وہ ہری بھاؤ کے درشن لینے۔ ہری بھاؤ آپ پر فرگیوں کا لج اور شنی وار واڑہ ان تینوں کو نمکار کر کے وہ واپس لوئے، جدید

ادب سے متعلق ان کی محدود معلومات دیکھ کر مجھے برا لگتا۔ اس کے باوجود کہ کا کالیکٹر جیسے لوگ اتنا کو کیوں بڑا مانتے ہیں اس بات پر تعجب ہوتا۔ کبھی کبھی لگتا کہ لوگوں کے بہت کم سمجھ میں آتا ہوگا تو کبھی کبھی لگتا اتنا کو بیکار کی جنبجھٹ میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی۔

وہ کرتنے کرتے تھے لیکن گانے سے زندگی بھر مخالفت رہی۔ کتحا لیکن وہ بہت سیدھے طریقے سے نہاتے تھے۔ ان کی مراٹھی بات چیت میں کوئی کی بلکل سی لپک تھی۔ میری ماں کوئی اور والد بیکاروں کے۔ میرے نانا مجھ کو کون مراٹھا کہہ کر پکارتے۔ ان کی کتحا سنتے بڑے بڑے لوگوں کا دل بھرا آتا۔ وہ دین انھیں پر نانا کی جانب سے ورنہ میں ملی۔ لوگ ہر لیش چند چلیا، ان کا ذکر سنتے سنتے بالکل روپڑتے۔ مجھے بھی روتا آتا۔ لیکن لوگ نہیں گے ایسا خواہ مخواہ ہی ذرلتا! صرف نانا گانے پر اتر آئے تو سنبھال کا جی نہ کرتا۔ سارے ابھنگ، شلوک بھی ایک ہی لئے میں نہاتے۔ بعد از آس میں بڑا ہو جانے پر ان کے بیانات میں گانا نانے کی ذمہ داری مجھ پر آئی۔ میں خوب اطف لیکر گانے میں مگن ہونے لگا، کہ اتنا دھیرے سے 'کافی ہوا' ایسا اشارہ کرتے۔ ان کے اشارے پر عمل نہیں کیا تو بالکل بے سرے آواز میں "سیتا کانت سمرن جنے جنے رام" کہہ کر پرده گردیتے اس کے برخلاف میرے والد اور ماں کو گانے کا بے حد شوق! اتفاق بھی اتنا بھیاںک تھا کہ میرے والد کے انتقال سے ایک گھنٹہ قبل ہی گھر میں گانے کی نشت پوری ہو چکی تھی۔ میری ماں کی آواز بھی میٹھی۔ ہمارے دو تین گانے گا کر ہوئے کہ نانا کہتے۔ "بہت ہوا بابا تمہارے گلے میں درد ہونے لگے گا"۔

ایک بار وہ میرے گانے کے پروگرام میں آئے۔ آخر تک میٹھے رہے۔ بس کرنے کے اشارے جاری ہی تھے۔ گانا ختم ہونے پر مجھ سے کہا۔

"پر شوتم، تجھے گانے یاد نہیں ہیں تو پھر کیوں گاتا ہے؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا"۔ یاد نہ رہتے ہوں تو لکھ لئے جائیں! میں کون سا گانا گاتے ہوئے بھول گیا، وہ مجھ یا نہیں آ رہا تھا۔ "ماوشی می آپلا بھتوئے۔ یہ وہی سدنے ۔۔۔ یہ وہی سدنے"۔ پچاس بار وہی وہی دہرارہتا۔ باتھ میں کاغذ لیا جائے اور صاف ستر اگانا گایا جائے۔ ایک بار! دوبار گایا جائے۔ یعنی اگر کسی کی سمجھ میں نہ آیا ہو تو مطلب صاف سمجھ میں آ جائیگا! فن گلوکاری اور کھاذ لکر کے نغموں کا مطلب ان دونوں سے متعلق ان کا بھرم زندگی بھر مجھے دور کرنے نہیں آیا میں بعد از آس

نامک میں داخل ہونے کے بعد وہ کبھی نامک دیکھنے آئے تو نہیں، لیکن ہمارے فن کی قدر دانی کے طور پر تری پھل چوران کی ایک بول انہوں نے مجھے دی تھی۔ ”شب بیداری کرتا رہتا ہے بلا ناغ استعمال کیا کر“۔ اتنا کو صرف اتنا معلوم تھا کہ نامک کرنے میں جاگنا پڑتا ہے۔ انہوں نے ایامِ جوانی میں ”سماجوتی“ نام کا نامک لکھا تھا۔ مراٹھی تھیز کی خوش نصیبی سے اُسے کھینے کی کسی نے جسارت کی ہی نہیں۔

میری ماں یا انکی اکلوتی بیٹی۔ ان کے دل میں اُسے خوب پڑھانا تھا۔ پر وہ زمانہ، ہماری پرانے خیالات کی تانی اور مالی دشواریاں یہ تینوں چیزیں اس کی تعلیم کی راہ میں حائل ہوئیں۔ میرے نانا خیالات سے اصلاح پسند۔ ایک دوسری بار شادی کروانے میں پر وہہت کے فرانس انعام دئے تھے۔ لیکن گھر میں روزانہ پشت در پشت چلی آرہی پوچھا ہوتی تھی۔ منکیش یا ان کے خاندانی دیوتا۔ دراصل دو بھاشی خاندان یہ گودا کا۔ کچھ عرصے بعد ان کے اجداد کا روار چلے گئے۔ سارے رسم و رواج جوں کے توں پالے جاتے۔ پکائے ہوئے کھانے دیوتا کو دکھائے جاتے لیکن وہ پوچھا پاٹ کے کپڑے نہ پہنتے ہوئے ذھلے کپڑے پہنتے۔ ایک بار کہے ہوئے وقت پر آپا دھیاۓ بو انہیں آئے یوں ہی نہ آئے تو کوئی بات نہ تھی، کسی امیر میز بان کے گھر سے بُلا دا آیا اس لئے انہوں نے اس دعوت کو نظر انداز کر دیا۔ نانا نے میری ماں کو پوری پوچھتی کھادی تھی یہاں تک کہ گپتی کی پران پر تسلیم (دیوتا کی شکتی مورتی میں لانا) پوچھی۔ ماں پوچھا کے بول پڑھتی جاتی اور نانا پوچھا کرتے۔ صرف شزادھا (موت کے بعد مرنے والے کی خاطر کھلانے جانے والا) کا کھانا بحث جی کو پہنچا دیتے۔ آپا دھیاۓ بو اکی ان کے سامنے بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ بہت سی باتوں میں وہ اپنی سوچ کی مطابق بھی عمل کرتے۔ جو شش اور مشتوی پران کا یقین نہیں تھا، اصل کاروباری زبان میں وہ ”شری منکیشا“ سے مصائب دور کر کے سھوں کو سکھی رکھنے کی بفتی کرتے۔ گھر میں کوئی یہاں پڑھ جائے تو دیوتا سے اپنی زبان میں بات کر کے ظفر عنایت رکھنے کی گذارش کرتے۔

آگر کمزورانڈے یا ان کے مطمح نظر، کبھی کبھار، مہارا شتر کی سب سے عظیم شخصیت آگر کریے ان کی رائے سن کر، تلک ہائی میں انگریزی چوتھی پانچویں میں زیر تعلیم مجھے ان کی لامبی پر رحم آتا بخود پڑاتا ہے۔ یہ آدرس اپنے سامنے رکھ کر انہوں نے سماجی اصلاح کے کام کی شروعات کاروبار جیسے جگہ سے کی۔ سولہ سترہ

سال کے ان دو چار جوانوں نے ”نہرو اسکول“، ”قائم کیا“، ”متر سماج“، ”نکلا۔ کا کا کالیکری“ اُن کے وہاں کے شاگرد۔ اُنھوں نے ”سرن یا ترا“ میں ”وامن ماستر“ نام سے میرے نانا کا ایک خوبصورت قلمی خاکہ پیش کیا ہے۔ میرے نانا کی سادھی نہ ہو۔ اتنے بڑے وہ نہ بھی ہوں شاید۔ پھر بھی کالیکر جیسے عظیم شاگرد نے ایک خوبصورت باتی مگر یاد سے رکھ دی ہے۔ اتنا کوئن تقریر کی دین حاصل تھی، خوش دلی بھری حس مزاج تھی، محنت کی تکلیفیں برداشت کرنے کی قوت تھی۔ اور ان سب کے ساتھ سنت ساہتیہ کے مسلسل مطالعے سے حاصل ہوئی مزاج میں نرمی تھی۔ وہ اپنے مخالف پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ اُنھوں نے ”رُگ ویدی“، یہ قلمی نام، میں تحقیق کتاب کے لئے ایک معمولی محرر ہوں اس لئے اس کا اہل نہیں ہوں اس پر خلوص خیال سے، رکھ لیا تھا۔ بمشکل تمام تک اُنھوں نے میڑک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن اعلیٰ پلان حاصل کر کے اُسے عمل میں لانے کی اُن میں زبردست طاقت تھی! میرا بڑا اماموں بہرا ہونے کی وجہ سے اُسے تعلیم دنیا ممکن نہیں تھا۔ اُس میں فن مصوری کا شوق پیدا ہوا اس لئے خود مصوری سمجھی۔ کاروبار میں قدرتی مناظر بے شمار۔ وہاں کے مناظر پر سیاح فدا ہوتے۔ یہ دیکھ کر اُنھوں نے قابل ستائش مناظر کی تصویریں اٹار کر اُس کا کاروبار بھی کیا۔ لڑکپن میں سرسوتی کی پوجا کے لئے بچوں کی طرح ایک کے ہندسے کی سرسوتی نہ کالتے ہوئے میرے نانا نے نکالی ہوئی صحیح صور پر بیٹھی ہوئی سرسوتی رہتی۔

نہرو اسکول اچھی طرح چلنے لگا اس کے بعد گھر یلو ٹکالیف کی پناہ پر وہ مبینی نوکری کی تلاش میں آئے۔ پھر بھی نوکری سے زیادہ رائل ایشیا نک سوسائٹی نگر ہالیے (لابریری) اُن کے مبینی آنے کی کشش کا خاص باعث تھا۔ اُس لابریری کی ممبر شپ حاصل کرنے کی طاقت نہیں تھی لیکن وہاں کے اُس زمانے کے لابریری میں اُن کے دوست تھے۔ اُن کی پہچان کا اُس لابریری سے اُنھوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اُنھیں ایک چھوٹی سی نوکری ملنے پر ”تبواروں کی تاریخ“ لکھنے کا پروجیکٹ اُنھوں نے چھوڑ دیا۔ اس کتاب کے لئے اُنھوں نے ضرورت سے زیادہ تکلیفیں اٹھائیں۔ وید، بہما، پرانوں کی تاریخ، علم نجوم، شاعری، یادداشت، مسلم سیاحوں کی مضمایں، سکے، کتبات اُن سب کا باریکی سے مطالعہ کر کے اُنھوں نے یہ کتاب لکھی۔ آنجمانی واسودیو گوند آپنے نے پیش لفظ میں اس کتاب کو ”سماجی اصلاحی افکار کی اوپاری تخلیق“، قرار دیا۔ البتہ جاری

محرر پیشے میں اس کتاب کی تیاری میں لگنے والے تحقیقی مطالعے کے لئے وقت نہیں مل پاتا، اس لئے ادھر ادھر سے چار پیسے جمع کر کے انہوں نے ایک پساری کی دکان ڈالی۔ بیوپار میں پیسے کہانا ہوتے ہیں ایسا لیکن ان کا مقصد نہ تھا۔ دکان کبھی بھی بند کر کے لکھنے پڑھنے مل جاتا ہے، یہ سہولت اس میں انھیں دکھائی دے رہی تھی۔ ترازو سامنے رکھ کر قدیم سکے جانچتے بیٹھے ہوئے اس بنے کے ہاتھ میں راجح سکے بمشکل ہاتھ آئے اور سارا بیوپار تنگ۔ بنے (تکارام مہاراج کی طرح سادہ لوچ) کی روایت پر پورا اُترنے والا ثابت ہوا۔ دکان میں طلبہ کی بیاضوں کی ردی آتی۔ اُس کی کوری پشت پروہ نوٹ لکھ کر رکھتے۔ ان کا خط ہی خوبصورت تھا۔ باریک پڑھنے لاکت کتابوں سے نکالی ہوئی یہ بیاضیں انہوں نے اپنی بڑھتی غربت کا مقابلہ کرنے کے لئے ردی کے مول کتابوں کے ساتھ بیج ڈالیں! پساری کی دکان بند کر کے ایک بار پھر وہ پیشے (کلر کی) محرری میں گھنے لگ گئے۔ وہاں بھی ان کا مراثی ایمان اور لگن برقرار تھی۔ ایک جاپانی کپاس کی فروخت کرنے والی کمپنی میں وہ نوکری کرنے لگے۔ اسی دوران اندر ہیری کے قریب جو گیشوری میں اپنے ساتھیوں کے انہوں نے ایک ہاؤسنگ کو آپریٹیو سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور اپنی استعداد سے باہر سینکڑ کلاس کا پاس نکالا۔ اندر ہیری تا قلابہ سینکڑ کلاس ریلوے ڈبے ان کی جائے مطالعہ تھی! اس وقت جھک جھک گاڑیاں تھیں۔ سینکڑ کلاس میں بالکل بھیز نہ رہتی۔ اندر ہیری سے قلابہ پہنچنے کافی وقت لگتا اس لئے ریلوے ڈبے میں آتے تھے اطمینان سے مطالعہ ہوتا۔ سببی میں وہ پہلی بار آئے، اس دن نوکری کی تلاش کرنے سے پہلے مبینی یونیورسٹی کے اطراف بلا مبالغہ پھیرے ڈالے۔ راجابائی نادر کی اونچائی سے جتنے وہ مرعوب نہیں ہوئے، اتنے ہی وہاں کی لاہبری کی کتابیں دیکھ کر خزانہ علم کے کمرے کو دیکھ کر محوجت ہوئے۔ تحریری اور زبانی دونوں سطح پر لفظوں کی پاکیزگی برقرار تھی ایسا وہ زمانہ تھا۔

”نیگور کو“ گیتا نجلی، ”پر نوبل انعام ملنے پر انہوں نے بنگالی سیکھنا شروع کی۔ اور اس کے بعد ”ابھنگ گیتا نجلی“، اس کا مراثی ترجمہ کیا۔ ان کی شعری تخلیق میں خدا دادعت کا غصر ہوتا۔ تیز رفتار ہوتی۔ سنت شاعری کی مسلسل مطالعے نے لفظوں کا بھر پور خزانہ عطا کیا تھا۔ بطور شاعر ان میں تخلیقی مزاج کی پھرتی نہیں تھی۔ حالات حاضرہ پر تو وہ خوب شعر کرتے۔ نیگور کو تو وہ ”گیتا نجلی“ کی اشاعت کے بعد ان کے مبینی کے

قیام کے دوران ملنے گئے۔ اور ”ابھنگ گیتا بھلی“، کانسخان کے قدموں میں رکھ کر، انھیں کے ہم عمر میرے تانا نے، ٹیکوور کوان کے قدموں پر سر رکھ کر نسکار کیا۔ گاندھی نے ہندی کے لئے کئے ہوئے پُر سکار کے بعد ان کے ذہن میں ہندی کے لئے دیوانگی شروع ہو گئی۔ گھر میں ہندی کا جبر شروع ہو گیا۔ ایک بار سرو جنی نائید و کے انگریزی پچھر کے بعد انہوں نے ہندی میں اظہار تسلیک کیا۔ درحقیقت ان کی مادری زبان کا رواداری، ساری تعلیم کنڑی زبان میں پائی، انگریزی سے انھیں عقیدت تھی، سنکرت ان کے مطالعہ کا پسندیدہ مضمون، ان کے تخلیقات مراٹھی میں لیکن بنگالی یہ گردیوں کی اور ہندی گاندھی جی کی پسندیدہ زبان اس لئے ان دونوں زبانوں کا بڑی محنت سے مطالعہ کیا اور کپاس کی تجارت میں گجراتی کے بنا کام نہیں چلتا اس لئے گجراتی از بر کر لی۔

ان کے علاوہ اپنے پیچھے بے شمار لقب لگایا (کام کرنا) یہ انکا پسندیدہ مشغله تھا۔ گھر کے حالات ان کی شوقیہ طبیبی کی ہنا پر ہمیشہ بڑھتی رہتی۔ کبھی ہومیو پیتھی، کبھی آیورو یڈ تو کبھی با یو کیمیسری ایسے تجربات ہر وقت چلتے رہتے۔ کئی اداروں کی مجلس منظہر میں ہونے کے باوجود وہ کام کرنے کا باولا پن کرتے۔ ممبوح کے پر ارتھنا سماج کی ذمہ داری قبول نہ کرنے کے باوجود وہاں کے اصول پرستوں کی صحبت قبول کر لی پڑھانے کا فطری شوق نائٹ اسکول قائم کر کے پورا کر لیا۔ وہ شوقیہ وکیل، ڈاکٹر، انجینئر وغیرہ سب کچھ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی شد سے لیکر سمینٹ کے نزد تک کسی بھی موضوع پر مفت مشورہ دیا کرتے تھے۔ کسی نے نیا گھر بنانے کی ٹھانی کہ اُس کے مالک سے زیادہ ان کا جوش و خروش رہتا، خاص کر جھگڑے پڑھانے والے ثالث کا کام تو انہوں نے کئی بار کیا، جھگڑا پچھا دیا گیا کہ فریقین کے لوگوں کو کھانے کا اصرار کیا جاتا اور یہ گروپ کھا کر خوشی خوشی لوٹ گیا کہ ناتا اور ناتی میں عین وقت پر مہمان آنے پر جھگڑا شروع ہو جاتا ناتی دھرم راج، ’ٹکارام‘ جگ متر جیسے خطابات سے نوازتی اور ناتا ستر اط کی خاموشی سے یہ سب کچھ سن لیتے!

میں نے مگر ان کا سنار دیکھا، وہ سارے طوفان بھنم جانے کے بعد۔ لڑ کرتے سنورتے ہو گئے۔ اچانک بلڈ پریشر کی تکلیف کی وجہ سے انہوں نے ایک انگلش کمپنی کی بڑے عہدے کی جگہ چھوڑ دی اور ”ہندو دھرم دسپکا“ یہ لغت جیسی کتاب لکھتے اطمینان سے گھر بینہ گئے۔ پارے میں چھونا سا بنگلہ باندھا تھا ”دی پکا

میں انہیں خوب مالی دشواری اٹھانی پڑی۔ جاپانی کمپنی میں برس روزگار تھے ان دنوں یو پاریوں سے بنی جان پہچان کے سبب گجراتی مالداروں کی مدد سے کچھ کاپیاں انہوں نے بچ ڈالیں۔ لیکن نقصان بے حساب اٹھانا پڑا۔ اپنی کتاب کی سماج کو اب ضرورت نہیں رہ گئی ہے ایسا تصور کر لیا اور عمر کے آخری حصے میں عرض و گذارش کے خطوط لکھ کر ”گیتا نخلی“ اور ”دیپکا“ کی فروخت شروع کر دی۔ جو کچھ آمد نہیں وہ ساری گھرباند ہنسے میں اور کتابیں شائع کرنے میں صرف کر دیں۔ اس گھر کے چھوٹے سے دیوان خانے میں محیط تنا اور نانی کا سفارتخا۔ نانی کی طبیعت ناساز ہوئی اور ایک دوسرے کی خدمت کرتے یہ عمر جو زایکا یک اس طرح رہنے لگے۔ جس مفلسی کی حالت میں وہ ممبئی آئے، وہی حالت۔۔۔ رہتا گھر چھوڑ کر۔۔۔ پھر حاصل ہوئی۔ لیکن اب نفع تھک چکے تھے۔ زندگی میں خستہ حالات میں ساتھ بجا نے والی ساتھی بستر سے لگ چکی تھی۔ اپنے سنوار کے سکھ ڈکھ کے قصے نواسوں نواسیوں کو سنا نے کا ایک کام اتنا کے پاس رہ گیا تھا۔ اپنی اب کے بھی ضرورت نہیں، یہ نا امیدی بھرا خیال ان کے دل کو جلا رہا تھا۔ اسی وقت نانی کا انتقال ہوا اور اتنا تبا رہ گئے۔ اس سے پہلے میرے والد کا انتقال ہوا۔ اکلوتی لڑکی پر آئی ہوئی اس مصیبت سے وہ بالکل مذہل ہو گئے۔ ان کے لطیف، امنگ بھرے مزاج میں ایکدم فرق آگیا۔ دیوان خانے کی کھڑکی میں دور تک خاموش نظر جمائے بیٹھنا یہ ان کا پسندیدہ کام بن گیا۔ زندگی میں خلا پڑ گیا۔

جدید افسانوی ادب میں انہیں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے ایک بار انہیں مہاراشر کے معروف ناول نگار کا ناول انہیں پڑھنے دیا۔ وہ انہوں نے پڑھا اور مجھ سے کہا ”پرشوم‘ بہت خوبصورت زبان استعمال کی ہے اس قلم کار نے، لیکن کیوں رے اس ناول کے کردار کیا حقیقت میں اتنے اچھے ہیں، تعلیم یافتہ ہیں، محنتی ہیں، پھر خود کا بیاہ رچانے کی کوشش سے پرے دوسرے اور کچھ اچھا سا کیوں نہیں کرتے۔“

فن مصوری سے لگاؤ کی وجہ سے ترنگی سر درق انہیں کچھ خاص بندہ آتے! ایک خاتون قلم کار کے ناول کا سر درق دیکھ کر اس قلم کار کے خسن کے بارے میں اُس میں غلط فہمی ہو گئی تھی۔ جدید شاعروں میں وہ کیشوںست، تابنے ان سے پرے کچھ زیادہ نہیں بڑھے۔ جدید و دوانوں میں ان۔۔۔ پھانک کے بارے میں انہیں خاص احترام تھا۔ ”ذہانت زہر گھونا تھ جیسی ہونی چاہئے ان کے دماغ میں ایشور نے فوٹوگرافی کی

کا بچ رکھ دی ہے، کہا کرتے۔ ان کی "گیتا بھلی" ساہتیہ سمیلن میں تک پھانک نے پہلے پہنچا دی تھی۔ پرسوں کاردار کے ساہتیہ سمیلن میں بڑے بڑے و دوانوں کے سامنے اپنے نام کا ذکر ہوا یہ حقیقت انہوں نے مجھے بذریعہ خط شہرت کے دروازے پر دستک دینے والے قلمکاروں کی سی امنگ کے ساتھ لکھی۔ کئی سالوں بعد انہا نام اخبار میں شائع ہوا۔ یکھر "ابھی تھوڑی سی یاد ہے لوگوں کو میری" ایسے الفاظ کہے انہوں نے۔ کاردار کے ذاکر کیکنی یہ ان کے ہندو اسکول کے شاگرد۔ کائیکر اور کیکنی یہ دونوں ہر سال بلا نامہ انہیں ملنے کے لئے آتے۔

قلم کا راس شے سے انہیں عقیدت تھی۔ اچھا بُرا کیسا ہی کیوں نہ ہو، فلاں شخص قلمکار ہے یہ چیز ان کے لئے قابلِ احترام تھی۔ وہ ادب جدید کا زیادہ مطالعہ نہیں کرتے تھے اس لئے یہ احترام آخر تک برقرار رہا۔ میں سینما ناٹک میں ہوں یہ ان کے نزدیک کوئی باعث خوشی بات نہ تھی۔ میں جب یکھر بنانا اُس وقت مگر اس کا سینہ تن گیا۔ ان کے نظروں کے سامنے بھانڈ رکر، رینگر پرانچے جیسے پروفیسر تھے، ان میں پوشیدہ عزت احترام کا پہلو چھوڑ دیا جائے تو ان کے جتنا اس واقعہ سے خوشی ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ مجھے لکھے جانے والے خطوط میں پروفیسر پر شوم کو بے شمار آشیرواد، جیسے القاب والا جملہ نہ بھولتے ہوئے وہ لکھتے مجھ سے وہ کہتے "اے، اب تو پروفیسر ہو گیا ہے، ذرا سمجھیگی سے رہنا سیکھ۔ لوگ و دوان جان کر تیری طرف دیکھیں گے....." دور جدید میں پڑھانے والے کے لئے کچھ زیادہ جاننا ضروری نہیں، یہ "وودھ اوینان و ستارا" سے زیادہ اور کچھ نہ پڑھنے والے ہمارے پرانے زمانے کے بھولے نانا کو کیا معلوم؟ مجھے صرف اتناطمینان ہو رہا ہے کہ انہیں یہ علمی کائنات کا سکھ انہیں میں ان کی عمر کے آخری حصہ میں تھوڑا بہت دے سکا۔

آخری وقت دیوان خانے کی اس کھڑکی میں وہ خوب بیٹھے رہتے۔ پچھلے کئی سالوں سے وہ ایک وقت ناچنی کی روٹی اور کوئی بھی پتوں کی سبزی یہ ان کی خوراک تھی۔ بلڈ پریشر کا مرض بڑھتا جا رہا تھا۔ یادداشت نہ رہتی۔ بے حصی کی حالت میں رہتے۔ کبھی کسے پہچان لیا تو پہچان لیا، باقی وقت اطمینان سے کھڑکی میں بیٹھے رہتے۔ روزانہ کی پوچھا پاٹ وغیرہ سب کچھ رک گیا تھا۔ ایک بار میری ماں نے ان سے پوچھا "انا اتنی دیر آپ مینھ کر کیا دیکھتے ہیں؟"

”دعوت کا انتظار“ اتنا نے کہا۔ تھرا تے قدموں سے وہ الماری کے پاس گئے ”ابھنگ گیتا نجیل“ کھولی۔ کا نپتی آواز میں پڑھنے لگے۔

”ما جھیا گرہ دواری اے اُنی ناکلا۔ تو از ودھاڑی لامر تیو دوت  
پرتی را ہونی آلا ہاگھے اوں تجھے نمتران مزلاگی.....“

اس کے بعد ایک دو ہفتے کے اندر ہی دعوت نامہ لے کر آئے ہوئے موت کے فرشتہ کو ان کا پتہ مل گیا۔ مجھے بیلگاؤں میں اتنا کے چل بننے کا تار آیا۔ اس وقت پروفیسر پ۔ ل۔ دیشپانڈے رمی کادا وجہائے بیٹھے تھے!



(گنگوت)

## مصنفوں کی دیگر تصانیف

- ۱۔ اردو ادب اور گاندھیائی افکار مرتب
- ۲۔ باقی نشاں ہمارا (حب الوطنی پر مبنی کہانیاں) مرتب
- ۳۔ دریچہ (مراٹھی تخلیقات کے تراجم)
- ۴۔ بھل نے کہا دھرتی سے (ڈرامہ) ترجمہ

## زیر طباعت

- ۱۔ پریم چندنی جہتیں (مرتب)
- ۲۔ یادوں میں بے لوگ (قلمی خاکے)
- ۳۔ اپنے قلم سے (مضامین)
- ۴۔ ورق گردانی (تبرے)

# AKS

(Marathi sketches written by : P. L. Deshpande)  
 Translation into Urdu by : Mohammad Husain Parkar

ISBN 81 - 902- 435-3-5



محمد حسین پرکار کی پیدائش ۲۲ جون ۱۹۳۹ء کو بانگلور ضلع رتنا گیری، مہاراشٹر کی سر زمین پر قاضی پرکار خاندان میں ہوئی۔

دفتری امور کے مطابق آپ کی تاریخ پیدائش ۰۱ مری ۱۹۳۸ء درج ہے۔ بحیثیت انسان محمد حسین پرکار اصول پرست، نیک طینت اور صالح طبیعت کے مالک جانے جاتے ہیں۔ آپ نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے ہی اسکول میں حاصل کی۔ ہائی اسکول کی تعلیم نیشنل ہائی اسکول داپولی ضلع رتنا گیری میں حاصل کی، اساعیل یوسف کالج جو گیشوری، ممبئی اور ممبئی یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ ماچھری یونیورسٹی (انگلینڈ) سے تعلیم بالغاء میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما حاصل کیا۔ آپ کو لکھنے پڑھنے کا شوق اسکول کے زمانے سے ہی رہا ہے چنانچہ آپ کالج کے والی پیپر اور میگزین کے لیے بہت کچھ لکھتے رہے اُس کے ساتھ اردو رسائل میں مختلف موضوعات پر مضمایں بھی شائع ہوتے رہے۔ آپ کو اردو کے علاوہ مراتشی زبان پر بھی عبور حاصل ہے اسی سبب آپ مراتشی ادب کو بڑے ہی چاکر دستی سے اردو کے قالب میں ڈھال لیتے ہیں۔ زیر نظر کتاب "عکس" اس کی عمدہ مثال ہے۔

ہندستانی پوچار سماں، مुंबای

ہندستانی پر چار سبھا کی اشاعت

